حقوق العلم
مع
نافع الطلبہ

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ

کتب خانہ امداد الغرباء
محلہ مفتی ـــــ سہارن پور

قال اللہ تعالیٰ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

رسالہ نافعہ

حقوق العلم

از

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

مع

ناصح الطلبہ

از مولانا محمد عبد اللہ صاحب گنگوہی

ناشر

کتب خانہ امداد الغرباء محلہ مفتی سہارنپور

نام کتاب — حقوق العلم

مصنف — حکیم الامت مولانا تھانوی رح

طبع سوم — محرم الحرام ۱۴۰۱ھ

کتابت — منشی عبد العزیز خورجوی

مطبع — محبوب پریس دیوبند

سید نور الحسن تھانوی

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یو، پی

۲- مکتبہ وصیۃ العرفان ۲۳ بخشی بازار الہ آباد "

۳- مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر "

۴- عظیم بک ڈپو، دیوبند ضلع سہارنپور "

۵- کتب خانہ امداد الغربا مفتی اسٹریٹ سہارنپور "

حقوق العلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ احقر اشرف علی رقم طراز ہے کہ جس مبحث پر میں اس وقت لکھنا چاہتا ہوں اجمالی تعیین اس کی عنوان بالا سے ظاہر ہے اور تفصیلی تعیین اُس کی یہ ہے کہ اس زمانہ میں علوم دینیہ کی طرف سے عام بے رغبتی کی جو حالت ہے اُس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اور سبب اس کا تامل سے کام لینے سے دو امر معلوم ہوئے ایک کا عام لوگوں سے تعلق ہے دوسرے کا علماء سے۔ امر اوّل عام لوگوں کی بے خبری اُن تعلقات سے جو علوم دینیہ کو عام معاملات سے ہیں۔ یا اُن کے وہ خیالات و شبہات ہیں جو علوم دینیہ کے نتائج و اغراض یا طالبین و محصلین علوم یا حال کے معلمان دین کے خاص حالات کی نسبت اُن کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور وقتاً فوقتاً خواہ تہذیب کے ساتھ یا مطلق العنانی کے ساتھ اُن کی زبان اور قلم سے ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

امر ثانی اہل علم مشتغلین یا فارغین کے بعضے نامناسب افعال و ناموزوں

اعمال ہیں جو بوجہ نقص علم یا فقدان تہذیب و تربیت بعض سے صادر ہو جاتے ہیں اور عام لوگ اُن پر مطلع ہو کر بقیہ کو بھی اُن پر قیاس کر کے سب پر ایک حکم لگا کر علوم سے نفرت قائم کر لیتے ہیں۔ یا اگر عام کو بھی احساس نہ ہو تب بھی بعض اعمال کے خود مفاسد ایسے ہوتے ہیں جو جمہور میں کوئی ایسا برا اثر جو شرعاً ناپسندیدہ ہے پیدا کر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ سب لے رغبتی جو ان دو امر سے مسبب ہے سبب بن رہی ہے۔ یوماً فیوماً علوم کی کمی اور جہل کی زیادت کا جو کہ اُس کے لوازم سے ہے یا اس کا عین ہے اور اس کا ثمرہ ہے بربادی آخرت کی اور بربادی دنیا کی بواسطہ جیسا کہ ارشادات حقہ سے ثابت ہے کہ عقائد و اعمال فاسدہ سے دنیا کا بھی خسارہ ہوتا ہے۔ گو بوجہ فساد مدرکہ کے فی الحال محسوس نہ ہو لیکن مدرکہ سے کام لینے سے فوراً مدرک ہوتا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ وغیر ذلک من الآیات الکثیرۃ والاحادیث الوافرۃ (چنانچہ کسی قدر بسط کے ساتھ یہ مضمون میرے رسالہ جزاء الاعمال میں مذکور ہوا ہے) اور اس صورت میں کون عاقل ہوگا کہ اس خسارہ دارین کے تدارک کی ضرورت میں اُس کو کلام ہوگا؟ اور تدارک کا حاصل ہے رفع اسباب فساد۔ اور اس فساد کی سبب علم کی کمی تھی۔ اور اس کا سبب وہ دو امر بالا تھے۔ پس لامحالہ ان دو امروں کا ازالہ نتیجہ ہوا تمام تر اصلاحات کا۔ پس یہ تحریر مختصر انہیں دونوں امور

مذکور کی اصلاح ہے۔ یہ تفصیلی تعیین ہے اُس مبحث کی۔ پس بنا بر تقریر ہذا اس تحریر کے دو جز ہوں گے۔ ایک عام اصحاب کو اُن کی ان اغلاط پر متنبہ کرنا جو درباب علم و اہل علم اُن کو واقع ہو رہی ہیں دوسرا خاص حضرات اہل علم کو اُن کے بعض امور اصلاحیہ کی طرف متوجہ کرنا جو علم و عمل کے متعلق ہیں۔ اور چونکہ یہ سب اصلاحات عامیہ و خاصیہ علم دین کے حقوق مہتم بالشان سے ہیں اس لئے اس تحریر کا نام حقوق العلم اور اس کے پہلے جز کا عنوان حقوق العلم علی العوام من اہل الاسلام اور دوسرے جز کا لقب حقوق العلم علی العلماء الاعلام والطلبة الکرام تجویز کرتا ہوں محرک اس کے (کہ وہ اس حیثیت سے مستحق دعائے خیر کے ہیں۔ مشفقی مکرمی منشی فضل حسین صاحب مالک رسالہ ضیاء الاسلام مرادآباد ہیں۔ اور سبب تحریک (کہ وہ اس حیثیت سے مستحق دعائے برکت و اعانت ہے) اُن کا ایک نیا پرچہ مسمی بہ المشیر ہے۔ جس کا موضوع خاص علوم دینیہ کی خدمت ہے اُس کے جس پہلو سے بھی متعلق ہو۔ جس کا سلسلہ انہوں نے پرانے پرچہ ضیاء الاسلام ہی سے بقدر ضرورت شروع کر دیا تھا مگر تبعیۃً اور استقلال میں باہمیۃً دائرۃً جو تفاوت ہے اُس نے ایک نئے پرچہ کی ضرورت کو بھی ثابت کر دیا۔ اور اسی ضرورت سے مجھکو اس کی تحریک کی۔ پس امتثالاً للامر الممدوح واحتساباً و خدمت للدین میں اس تحریر کو اس[۵] پرچہ کی نذر کرتا ہوں اور اس تحریر کے ختم پر عجب نہیں کہ دوسرے

[۵] اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

بحث کے ذریعے سے اور کوئی خدمتِ دین تجویز کر کے اس پرچہ کی نذر کرسکوں۔ واللہ الموفق۔

الباب(۱) الاوّل
فی حقوق العلم علی العوام من اہل الاسلام

فصل پہلی۔ بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ علمِ دین کا تعلق صرف نماز و روزہ سے ہے اور اُس کے لئے چند اُردو رسائل مسائل کا یا معمولی مولویوں کا وجود کافی ہے۔ جس کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں اور وجہ اس سمجھنے کی یہ ہے کہ اصل میں ان صاحبوں کو یہی خبر نہیں کہ دین کے کیا کیا اجزاء ہیں۔ اس لئے دین کو صرف روزہ نماز میں منحصر سمجھ رکھا ہے۔ اور اول غلطی یہی ہے خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کے اجزاء کلیہ پانچ ہیں۔ عقائدؔ۱۔ عباداتؔ۲۔ معاملاتؔ۳۔ معاشرتؔ۴۔ تہذیبِ۵ اخلاق یا تربیتِ نفس۔ چنانچہ دلیل و تفصیل اس دعویٰ کی میرے رسالہ

۱؎ (نوٹ صفحہ سابقہ) چنانچہ یہ رسالہ حقوق العلم اول اول اس پرچہ میں نکلنا شروع ہوا تھا پھر کئی پرچوں کے بعد بعض مصلحتوں سے وہ رسالہ اخبار الاسلام مذکورہ بالا میں نکالا جانے لگا۔ اب وہ مجموع طور پر حاجی محمد بشیر صاحب کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ اُن پرچوں میں اس کے ابواب فصول بعض عوارض سے جن کا ذکر اس کے بعض حواشی میں ہے مرتب نہ تھے۔ اب ان عوارض کے ارتفاع سے سب مرتب ہو گئے۔ ۱۲ منہ سلمہم اللہ تعالیٰ۔ اب دوسری بار مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون سے شائع کیا جارہا ہے ۱۲ ظہور۔

تعلیم الدین کے خطبہ میں موجود ہے (اور یہ رسالہ انہی پانچ جز کی مختصر شرح ہے) اور جو شخص ہر وقت اپنے جمیع اقوال و افعال و احوال کو تفصیل وار دیکھتا رہے گا اور ہر جزئیے کے متعلق احکام شرعیہ کی تفتیش کی فکر میں ہوگا اس کو معلوم ہوگا کہ نہ مختصر رسالے اس کے لئے کافی ہیں اور نہ معمولی مولوی۔ اس میں کس درجہ وسعت ہے اور اس کے ماہر کس قدر قلیل ہیں۔ اور کس درجہ جماعت کی اور حاجت ہے۔ جن کو ایسا احاطہ ضروریہ حاصل ہو پھر اس جماعت کی تیاری کے لئے کس قدر سامان اور اہتمام کی ضرورت ہے اور موجودہ سامان اس کے مقابلہ میں کتنا کم ہے۔

فصل دوسری — بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مولوی بننے میں اس قدر وقت صرف ہوتا ہے کہ پھر علوم معاش کے تحصیل کی گنجائش نہیں رہتی۔ پھر اگر علوم معاش کو حاصل نہ کیا جاوے اور اولاد کو مولوی بنایا جاوے تو پھر کھائیں پئیں کہاں سے۔ پس اس کا انجام بجز ذلت اور پریشانی کے اور کچھ نہیں ہے اس لئے مولوی بنانا ذاتی و قومی ترقی کو مضر ہے۔ ان صاحبوں سے اس میں چند غلطیاں ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ علماء کے علم دین کو ضروری کہنے کے معنے یہ سمجھے کہ ہر شخص کو پورا مولوی بنانا واجب ہے۔ سو خوب سمجھ لیا جائے کہ علماء کا ہرگز یہ مقصود نہیں۔ کیونکہ علم دین کا ضروری ہونا اور بات ہے اور پورا مولوی ہونا اور بات ہے۔ علم دین کی دو مقداریں ہیں۔ ایک مقدار یہ کہ عقاید ضروریہ کی تصحیح کی جائے۔ عبادات ضروریہ کے ارکان و شرائط و احکام ضروریہ معلوم ہوں۔

معاملات و معاشرات میں جنسے اکثر سابقہ پڑتا ہے ان کے ضروری احکام معلوم ہوں۔ مثلاً یہ کہ نماز کن کن چیزوں سے فاسد ہو جاتی ہے کن کن صورتوں میں سجدہ سہو واجب ہوتا ہے۔ اگر سفر پیش آوے کتنے سفر میں قصر ہے۔ اگر امام کے ساتھ پوری نماز نہ ملے تو بقیہ نماز کس صورت میں کس طرح پوری کرے۔ قضا کے کیا احکام ہیں۔ زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے۔ اور اس کے ادا میں کیا کیا شرائط ہیں۔ علیٰ ہذا حج و صوم کے احکام۔ اور یہ کہ نکاح کن کن عورتوں سے حرام ہے۔ کن الفاظ سے نکاح جاتا رہتا ہے۔ عدت ولایت نکاح کے کیا احکام ہیں۔ رضاعت کے اثر سے کون کون رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ مبادلۂ اموال میں کیا کیا رعایت واجب ہے۔ کسی جائداد یا آدمی کی اجرت ٹھیرانے میں کون کون صورتیں جائز ہیں کون ناجائز ہیں۔ فیصلہ قضایا کا (اگر یہ شخص صاحب حکومت ہے) حسب قوانین شرعیہ کس طرح ہوتا ہے (گو ان کے الفاظ پر قادر نہ ہو مگر جاننا اس لئے واجب ہے کہ دوسرے فیصلوں کے حق ہونیکا اور شرعی فیصلوں کے ناحق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے) کون کون لباس حلال ہیں کیا کیا حرام ہیں۔ نوکریاں کون جائز ہیں کون ناجائز ہیں (اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز ہی میں مبتلا ہو مگر علم احکام سے اس کو قبیح تو سمجھیگا۔ اور دو جرموں کا مرتکب تو نہ ہوگا، ایک مباشرت فعل ناجائز۔ دوسرے اسکو ناجائز نہ سمجھنا) ماکولات و مشروبات میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ اسباب آرائش میں کس کا استعمال درست ہے کس کا نادرست ہے۔ اخلاق باطنی میں محمود و مذموم کا امتیاز ہو۔ اس کے معالجہ کا طریق معلوم ہو۔ مثلاً ریاء کبر و غضب و حرص و طمع و ظلم وغیر ذلک۔

کی حقیقت جانتا ہو تاکہ اپنے اندر انکا ہونا نہ ہونا معلوم ہو۔ پھر بعد ہونے کے ان کے ازالہ کی تدبیر کر سکے اور کوتاہی پر استغفار کیا کرے۔ یہ سب مقدار علم کی عام طور پر ضروری ہے کیونکہ بدون ان کے جانے ہوئے اکثر اوقات معصیت اور ناخوشی حق تعالیٰ میں مبتلا ہو گا۔ ہم نے ان احکام سے ناواقف اور علوم معاش کے اعلیٰ درجہ کے واقف لوگوں کو سخت غلطیاں کرتے دیکھا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ متنبہ کرنے سے بھی متنبہ نہیں ہوتے کیونکہ ان علوم سے مناسبت ہی نہیں۔ ایسے نمازیوں کو وطن میں عارضی قیام کے طور پر آنے میں قصر کرتے دیکھا ہے۔ زکوٰۃ، چندہ حجاز ریلوے میں دیتے ہوئے پایا ہے۔ روزہ میں سگرٹ پینے کو بعضے مفسد صوم نہیں سمجھتے۔ حج میں بے سیئے ہوئے اور بنیان کے طور پر بنے ہوئے کپڑے کو گو وہ پاجامہ کرتہ ہی ہو پہننے کو بعضے امراء نے جائز سمجھا حقیقی بھانجے کی دختر سے نکاح حلال جاننے والا میں نے دیکھا ہے۔ چاندی سونے کی مبادلہ میں یا حبوب و غلات کے معاملے میں یا ریلوے و ڈاک خانہ کے قوانین میں بے احتیاطی کرنے کو کوئی بھی خلاف شریعت نہیں سمجھتا الا ماشاء اللہ۔ سرکاری نرخ پر اگرچہ مالک سواری کا راضی نہ ہو جبر کر کے کسی سے کام لینے کو برا سمجھنے والے شاذ و نادر ہیں۔ نوکری اور لباس اور اسباب تعزیہ میں تو ایسے صاحبوں کے نزدیک کوئی جزئی ممنوع ہے ہی نہیں۔

اخلاق میں بجز تفاخر و تحقیر مسلمین و حرص دنیا کے جس کا نیا لقب اس وقت ترقی ہے سیکھا ہی نہیں۔ جنھوں نے بعض علوم کو فرض عین فرمایا ہے اس بعض سے یہی مقدار مراد ہے اور فرض عین کا یہی مطلب ہے کہ یہ سب کے لئے عام طور

طور پر ضروری ہے۔ دوسری مقدار یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے تجاوز
کرکے مجموعۂ قوم کی ضرورتوں پر لحاظ کرکے ونیز دوسری معترض قوموں کے
شبہات سے اسلام کو جس مضرت کے پہونچنے کا اندیشہ ہے اُس پر نظر کرکے
ایک ایسا وافی ذخیرہ معلومات دینیہ کا مع اس کے متعلقات ولواحق وآلات و
خوادم علوم کے جمع کیا جائے جو سابقہ ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔ یہ مقدار
فرض علی الکفایہ ہے۔ فرض عین کا حکم یہ ہے کہ ہر ہر شخص بانفرادہ اُس کا
مکلف ہے۔ جو شخص اُس میں کوتاہی کرے گا وہ گنہ گار ہوگا۔ اور فرض الکفایہ
کا حکم یہ ہے کہ اگر ہر مقام پر ایک ایسی جماعت قائم رہے کہ ان ضرورتوں کو
پورا کرسکے تو سب مسلمان گناہ سے بچے رہیں گے۔ ورنہ سب گناہ میں شریک
ہوں گے۔ اس تقریر سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ علماء علم دین کو بایں معنی ضروری
نہیں کہتے کہ ہر شخص اصطلاحی مولوی بنے۔ پھر علوم معاش میں حرج واقع ہونا
کیونکر لازم آیا جس کا وسوسہ عوام کو مانع ہو رہا ہے۔ ایسی تکمیل علوم دینیہ سے البتہ
یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ کافی تعداد میں ایک معتد بہ جماعت ایسی ہو جو ہر
طرح علوم دینیہ میں کامل مکمل محقق متبحر ہوں اور ایک بڑا حصہ عمر کا تحصیل میں
اور تمام عمر اُس کی اشاعت وخدمت میں صرف کریں اور اس کے سوا اُن کو کوئی کام
نہ ہو۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی جماعت کا ذکر ہے ولتکن منکم امۃ
یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر حدیثوں میں
حضرات اصحاب صفہ رضی کی یہی شان آئی ہے اور عام مسلمان اس جماعت سے
تغریراً وتحریراً اپنی ضروری دینی حاجتیں رفع کیا کریں۔ اُن میں جو پڑھنے کے

قابل ہیں جیسا کم عمر بچے یا وہ جو چندے یا قدرے معاش سے فارغ ہیں۔ اُن کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس جماعت سے سبقاً سبقاً کچھ رسالے عقائد و مسائل ابواب مختلفہ کے پڑھ لیں کہ اس طریق سے تھوڑے زمانہ میں بڑا ذخیرہ معلومات کا جمع ہو جاتا ہے۔ پھر نئے واقعات کے متعلق وقتاً فوقتاً اُس جماعت سے پوچھتے رہیں اور جو کسی سبب سے اس طرح پر نہیں پڑھ سکتے وہ اگر کم از کم ہفتہ میں ایک روز گھنٹہ دو گھنٹہ نکال کر ایک معین وقت پر جمع ہو کر کسی سمجھدار ذی علم سے درخواست کریں کہ وہ اُن کو ایسے رسائل پڑھ کر سنایا کرے اور سمجھایا کرے تو قریب قریب فائدہ مذکورہ کے اُن کو بھی حاصل ہو۔ اور ضرورت کے وقت پوچھتے رہنا یہ تو تمام عوام بلکہ خواص و علماء کے لئے بھی مشترک الوجوب ہے پھر ان طریقوں سے احکام پر مطلع ہو کر زبانی یا کتاب کے ذریعہ سے اپنے اپنے گھر کی مستورات کو پڑھاتے رہیں یا سناتے رہیں یا بتلاتے رہیں۔

اب اس مقام پر محبین دنیا کو دو شبہوں کی گنجائش ہے۔ ایک یہ کہ ایسی جماعت جو ضرورات دینیہ کے لئے کافی ہے ہر جگہ موجود ہے اور سلسلہ بھی اُس کا جاری ہے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بھی اسی میں مشغول کریں بلکہ مولوی لوگ دین کی ترقی کیا کریں اور ہم اپنی اولاد کو دنیا کی ترقی کے لئے تیار کریں۔ دوسرا شبہ یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو اگر مولوی بنائیں تو پھر یہ لوگ کھائیں کہاں سے اور یہی ہے ان صاحبوں کی دوسری اور تیسری غلطی منجملہ ان غلطیوں کے جن کے صدور کا دعویٰ اس فصل کے شروع کے مقولہ

منقول کے جواب میں کیا گیا ہے۔

چنانچہ جواب شبہ اوّل کا یہ ہے کہ خود یہ غیر مسلم ہے کہ ہر جگہ ایسی جماعت موجود ہے۔ ہندوستان کے علمی خطے چھوڑ کر آگے بڑھ کر جو حالت ہے اس کو ملاحظہ فرمایا جاوے تو دو قسم کے مسلمان ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں نظر آویں گے۔ ایک وہ جو شہر کے شہر انگریزی میں ایسے منہمک ہیں کہ پورے شہر میں کوئی شخص حلال و حرام کا بتلانے والا موجود نہیں۔ دوسرے وہ جن کو نہ انگریزی سے مس ہے نہ علوم دین سے۔ بالخصوص صدہا دیہات ایسے ہیں جہاں نماز جنازہ کا پڑھانے والا کوئی نہیں۔ نکاح کا پڑھنا کوئی نہیں جانتا۔ ذبح کے شرائط کوئی نہیں جانتا۔ پڑھی ہوئی چھری سے ذبح کرتے ہیں۔ اُن کے بزرگوں کے وقت سے بعضے خاندانوں سے تعلق پیری مریدی کا چلا آتا ہے جن کی اولاد میں اس وقت محض جاہل اور طماع اور مکار رہ گئے ہیں۔ وہ فصل پر بھی اور خاص خاص مواقع پر بھی دورہ کرتے ہیں اور اپنی جیب بھر لے جاتے ہیں اور غلط سلط باتیں بتلا کر جن میں اپنی مصلحتوں کی سرتاسر رعایت ہے۔ مصداق ضلوا فاضلوا کے بنتے ہیں بعض جگہ ایسے چھوٹے رہنما بھی نہیں ہیں۔ وہاں کے لوگ بالکل ہندوؤں کی رسموں کے معتقد بھی ہیں اور عامل بھی ہیں۔ بعضی جگہ عمر بھر بھی کسی عالم کا گذر نہ ہوا ہوگا۔ اور اگر کوئی بھا پھنسا ہوگا تو جان سے تنگ آگیا ہوگا تو اب اس کہنے کی کب گنجائش رہ گئی کہ ہر جگہ ایسی جماعت علماء کی موجود ہے۔ جماعت درکنار ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں ہوتا تو کیا مسلمانوں پر واجب نہیں کہ وہاں کے لئے ایسی جماعت

تیار کریں پھر وہ جماعت بجز مولویوں کی جماعت کے اور کون ہوسکتی ہے غیر علماء اگر کبھی ہمت کر کے ایسے مقامات پر جاتے ہیں یا جاہل و بدعمل واعظوں کو بھیجتے ہیں تو تجربہ سے ان لوگوں کا ضرر نفع سے زیادہ ہوتا ہے۔ جب مولویوں کا وجود ضروری ہوا تو اس کا اہتمام بھی واجب ہوا۔ تو پھر عام مسلمان خصوصاً امراء کا طبقہ کس بھروسہ پر بے فکر بیٹھ سکتا ہے۔ بعضے اہتمام کو ضروری بھی سمجھتے ہیں اور مکتب و مدارس بھی قائم کرتے ہیں۔ اور خیر خواہی اسلامی و قومی کا دعوٰے کرتے ہیں مگر اس کام کے لئے اپنی اولاد کو کبھی تجویز نہیں کرتے۔ اولاد کے لئے تو ڈپٹی کلکٹری منصفی وسب ججی و بیرسٹری تجویز کی جاتی ہے۔ اور مولویت کے لئے جسکو بزعم خود ایک ذلیل کام سمجھتے ہیں۔ ذلیل لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے غور کا مقام ہے کہ جس کام کے لئے ذلیل لوگ منتخب کئے ہیں اس کام کی وقعت ان مجوزین کے قلب میں کیا ہو گی۔ کیونکہ طبعی امر ہے کہ معزز کام کے لئے معزز لوگ تجویز کئے جاتے ہیں اور ذلیل کام کے لئے ذلیل لوگ منتخب ہوتے ہیں سو ایسے لوگوں کا تجویز کرنا خود دلیل اس کی ہے کہ ان حضرات کے قلب میں خدمت دین ذلیل کام ہے بس یہی ان کی بڑی شکایت ہے اور یہ علامت اس کی ہے کہ اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اگر یہ کام ضروری ہے اور باوقعت ہے اور اس کا اہتمام کرنا قومی و اسلامی ہمدردی و خیر خواہی ہے تو اس شرف کے لئے اپنی اولاد کو کیوں نہیں تجویز فرمایا جاتا۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ قدرتی بات ہے کہ جو کام معزز طبقہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے وہ عام انظار میں معزز و ضروری سمجھا جاتا ہے تو امراء کے ذمہ بہ نسبت غرباء کے زیادہ حق

ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس خدمت کے لئے وقف کریں پھر اولاد میں بھی اُسکو تجویز کریں جو ذہین و فطین و سلیم و فہیم ہو نہ یہ کہ جو سب میں کودن ہو صاحب اس کو مولوی بنائیں گے جیسا کہ واقع ہو رہا ہے۔

رہا دوسرا شبہ کہ ہم اپنی اولاد کو اگر مولوی بنائیں گے تو وہ کھائینگے کہاں سے۔ اگر یہ شبہہ ان حضرات کو ہے جو اپنی اولاد کی تعلیم میں بیس بیس بلکہ چالیس چالیس ہزار روپیہ صرف کرتے ہیں۔ تب تو یہ جواب ہے کہ اسی روپیہ کی اگر جائداد خرید کر اسی فرزند کے نام کردی جائے تو وہ قناعت اور راحت کے ساتھ اُس کی آمدنی سے اپنی گذر کرلے گا۔ پھر یہ سوال ہی متوجہ نہ ہوگا۔ اور اگر یہ شبہہ متوسط درجہ والوں یا غیر متمول لوگوں کو ہے تو جواب اس کا قرآن مجید میں موجود ہے لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ جس سے ایک قاعدہ مفہوم ہوتا ہے جس کو فقہا نے سمجھ کر اس پر بہت سے فروع متفرع کئے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کی منفعت کے لئے محبوس ہو۔ اس کا نفقہ اُسپر واجب ہوتا ہے۔ نفقہ زوجہ کا زوج پر قضاۃ و ولاۃ کا نفقہ بیت المال میں۔ جس کا حاصل وجوب جمیع مسلمین پر ہے۔ اسی قاعدہ پر متفرع ہے۔ پس جواب کی تقریر یہ ہوئی ہے کہ جب یہ جماعت خدمتِ دین کے لئے جو مدلول ہے۔ فی سبیل اللہ کا محبوس اور وقف ہے جو مدلول ہے احصروا کا۔ تو ان کے حوائج کی

کفایت کی قدر جو مدلول ہے فقرار کا ان کا حق مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے جو مدلول ہے لام استحقاق کا تو جمہور مسلمین کو چاہیئے کہ ان کے مصارف کی کفالت کریں خواہ تعیین کے ساتھ جیسے مدرسین و واعظین کی تنخواہ خواہ بلا تعیین جیسے متوکلین کی خدمت پس وہ شبہ منقطع ہو گیا اور اس آیت سے علاوہ فائدہ مذکورہ اور بھی چند فوائد معلوم ہوئے جن کو اس بحث میں گو دخل نہیں مگر تعلق ہے اس لئے ذکر کئے دیتا ہوں۔

ایک یہ کہ ایسی جماعت کو ذرائع تحصیل معاش میں بالکل مشغول نہ ہونا چاہیئے لا یستطیعون ضربا فی الارض اسپر دلالت کر رہا ہے اور اس سے یہ شبہہ بھی جاتا رہا جو عوام الناس علماء پر دنیوی معاش میں اپاہج ہونے کا الزام دیتے ہیں اور ثابت ہو گیا کہ بایں معنی اپاہج ہونا ضروری ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام ہوا نہیں کرتے خصوص جبکہ ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول ہونے کی ضرورت ہو۔ بالید یا باللسان یا بالقلب اور خدمت دین ایسا ہی کام ہے اور تدریس علوم دینیہ یہ ذرائع معاش میں داخل نہیں بلکہ وہ تنخواہ بوجہ خدمت دین میں محبوس ہونے کے ہے۔ مگر تعیین کے ساتھ ہے اور یہ تعیین مصلحت قطع نزاع کے لئے ہے۔

ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کسی دنیادار کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرنا چاہیئے بلکہ اغنیاء کی طرح مستغنی رہیں۔ یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف اس پر دال ہے۔

ایک یہ کہ اموال کا سوال کسی سے نہ کریں یہ دال علیہ لا یسئلون

الناس الحافا کے لئے چندہ کی ترغیب اس میں داخل نہیں وہ دعا رالی الخیر ہے۔ اس میں اور سوال میں یہ آیت فرق بتلا رہی ہے لا یسئلکم اموالکم الی قولہ ھا انتم ھولاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ الایہ۔ ایک یہ کہ گو وہ سوال نہ کریں مگر دوسروں کو چاہیئے کہ اس کا تجسس رکھیں اور فراست و قرائن سے پہچان کر اُن کی خدمت کریں یدل علیہ قولہ تعالیٰ تعرفھم بسیماھم۔ ایک یہ کہ اُن کی خدمت کرکے احسان نہ رکھیں کیونکہ وہ اپنے نفع کے لئے ہے۔ یدل علیہ قولہ تعالیٰ۔ وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم۔

تیسری فصل — بعض دنیاداروں کا یہ اعتراض ہے کہ مولوی ہو کر پست خیالی اور کم ہمتی اور ذلت پسندی اور تنگ چشمی و دنارت اور قوت انتظامیہ کی کمی وغیرہ صفات رذیلہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ طلبہ عربی کے حالات دیکھنے سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے ان صاحبوں کو علوم دینیہ سے بددلی اور بے رغبتی ہو گئی اور اپنی اولاد کے لئے ان رذائل کے اندیشہ سے مولویت کو پسند نہیں کیا۔ یہ ہے حاصل ان صاحبوں کے حال اور خیال کا درباب علم دین و علماء دین کے۔ مگر ان صاحبوں نے ان احکام میں حقیقت شناسی سے کام نہیں لیا۔ بالکل سطحی نظر سے نہایت عجلت کے ساتھ بلا ثبوت فیصلہ کر دیا جس کی بناء پر خود ان صاحبوں پر اگر نا واقفی و بے تحقیقی و توہم پرستی و ظاہر بینی و کوتہ نظری کا الزام لگایا جاوے تو بالکل صحیح ہے۔

اب میں حقیقت واقعیہ عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ان الفاظ کے جنکو صفات رذیلہ کا معبر ٹھہرایا ہے، اول صحیح مفہومات کی تعیین ضروری ہے تاکہ اسکا فیصلہ ہو کہ آیا ان حضرات معترضین نے اونہی مفہومات میں ان کا استعمال کر کے اہل علم میں اُن کا تحقق تحقیق کر لیا ہے یا اُن مفہومات صحیحہ کو چھوڑ کر دوسرے معنی اپنی اصطلاح میں ٹھیرائے ہیں۔ سو جہانتک ان حضرات معترضین کے اقوال وافعال میں غور کرنے سے سمجھ میں آیا ہے یہ ہے کہ انہوں نے دنیا میں مال کی ترقی نہ کرنے کو پست خیالی اور ترقی کی فکر و تدبیر نہ کرنے کو چھوٹ کر قناعت ہے۔ کم ہمتی اور اخلاق میں جاہ و کبر کی تحصیل نہ کرنے کو اور وضع میں سادگی اختیار کرنیکو ذلت پسندی اور اپنے پرائے کے حقوق کے امتیاز کو تنگ دستی اور اسراف نہ کرنے کو نادرت اور دنیوی فضولیات میں انہماک اور دلچسپی نہ ہونے کے سبب اپنے بعض مصالح میں فروگذاشتوں کو فقدان قوت انتظامیہ نام رکھ لیا ہے اور اکثر اہل علم میں ان امور کو دیکھ کر ان کی طرف صفات رذیلہ کو منسوب کیا ہے۔ سو واقعی ان امور کا اکثر اہل علم میں ہونا مسلم۔ مگر کیا یہ امور واقعی رذائل ہیں۔ یا خلاف ان کے زعم کے فضائل ہیں تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو قرآن وحدیث اس کے فیصلے کے لئے کافی ہے۔ آیت کریمہ زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن الماٰب قل اؤنبئکم بخیر من ذلکم للذین اتقوا عند ربھم جنات تجری من تحتھا الانھار الخ اور آیت کریمہ

الذین ضل سعیہم فی الحیوۃ الدنیا وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا اور آیۃ کریمہ ان اللہ لایحب کل مختال فخور اور آیت کریمہ وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبہم الجاھلون قالوا سلاما اور لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اور ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین اور حدیث المؤمن غر کریم والمنافق خب لئیم وغیر ذلک من الایات والروایات کو غور کریجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ صفات مذکورہ جو اہل علم میں پائے جاتے ہیں آیا رذائل ہیں یا فضائل اور معترضین نے ان کا نام رذائل قرار دیکر ان کے مقابلے میں جو فضائل ٹھہرائے ہیں نصوص میں اُن پر وعیدیں وارد ہیں اور شریعت میں ان کے یہ نام ہیں۔ حرص۔ وطول امل۔ کبر۔ عجب۔ اتلاف حقوق۔ اسراف و تبذیر۔ حب الدنیا۔ غفلت عن الآخرہ۔ تو اب شریعت کے فیصلے کو مانیں یا ان مخترعین کی۔ اور اگر کوئی صاحب اسلامی فیصلہ پر راضی نہ ہوں تو حکمت و اخلاق کی کتابوں کو دیکھ لیجیے کہ جن مفہومات کے مقابلے میں وہ الفاظ قبیحہ موضوع کئے ہیں۔ آیا اُن کو اخلاق حمیدہ میں ذکر کیا گیا ہے یا اخلاق ذمیمہ میں۔ اور اگر کتب اخلاق بھی حجت نہیں بلکہ خود یہ اپنے قول ہی کو حجت سمجھتے ہیں تو ہم کو بھی مقابلے میں یہ کہنے کا حق ہے کہ نہیں ہمارا ہی قول حجت ہے۔ خاصکر جبکہ موید بارشادات انبیاء و حکماء بھی ہو۔ اب اُن صفات کو سُنئے جو علوم دین نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اُس حالت میں اور زیادہ بیہودہ ہوتی ہیں۔ جب علوم دین

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - کے ساتھ دوسرے علوم باطلہ یا صحبت اہل باطل
نے بھی اثر کیا ہو اُن کے یہ عنوانات ہیں۔ قارونیت۔ فرعونیت۔ ظلم۔
حمق خربہ جن کا حاصل بلفظ دیگر حرص و طول امل وغیرہ ہے جن پر وعیدیں
وارد ہیں۔ تو اگر علماء دین کو پست خیال ذلیل وغیرہ کہا جائے گا تو
اس سے زیادہ ضروری ہے کہ ان کے مقابل دوسری جماعت کو قارون
فرعون کہا جاوے اور اگر ان الفاظ کے صحیح معنی لئے جائیں یعنی پست
خیالی یہ کہ فقط اپنی تن پروری و شکم پروری سے مطلب ہو اور دوسروں
و نفع پہونچانے کا خیال نہ ہو۔ اور کم ہمتی یہ کہ مشقت سے گھبراوے
و آرام کی فکر میں رہے۔ اگرچہ حقوق ضروریہ تلف ہونے لگیں اور
ذلت یہ کہ مال کو آبرو پر مقدم رکھے اور اس کی تحصیل میں غیرت اور حیا
و طاق میں رکھ دے۔ اور تنگ چشمی یہ کہ ذرا ذرا چیز میں بخل کرے اور
شریعت اور مروت کو چھوڑ دے۔ تعلقات واجبۃ الحفظ کی کچھ پرواہ نہ
کرے اور دنارت وہی جو حاصل ہے ذلت و تنگ چشمی کا اور فقدان قوت
انتظامیہ یہ کہ اوقات کا پابند نہ ہو۔ جن ضوابط و آداب معاشرت کے
ساتھ دوسرے کی مصالح وابستہ ہوں اُن میں اختلاف کرے جس سے
دوسرے کی مصلحتیں فوت ہوتی ہوں۔ سو اگر یہ مراد ہے تو بلاشبہ یہ اخلاق
رذیلہ ہیں۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ بعض محصلین علم میں یہ اخلاق رذیلہ پائے جاتے
ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ علم دین کا خاصہ الخواص ہے یا کسی اور چیز کا نتیجہ

سو اس کا فیصلہ نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ دیکھا جائے کہ آیا یہ اخلاق رذیلہ سب اہل علم میں ہیں یا بعض میں ہیں بعض میں نہیں۔ شق اول تو بالمشاہدہ غلط ہے۔ صرف دوسری شق متعین ہے تو اتنا تو ثابت ہوا کہ یہ علم دین کا اثر نہیں ہے۔ ورنہ سب میں ہوتا ضرور کسی دوسری چیز کا اثر ہے۔ سو وہ دوسری چیز میری تحقیق میں خاندان اور صحبت کی کمی ہے۔ یعنی بعضے لوگ خاندانی حیثیت سے پست حیال و دنی ہوتے ہیں۔ اور اخلاق میں خاندان کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ لوگ اپنے شوق سے یا اسباب اتفاقیہ سے یا بعضے کھانا کپڑا چلنے کی غرض سے علم دین میں مشغول ہو جاتے ہیں اور تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ محض تعلیم تبدیل اخلاق کے لیے کافی نہیں تاوقتیکہ یا وہ فطری ہو یا اس کے لیے خاص تدابیر اختیار کی جاویں جن تدبیروں کو حضرات اہل طریقت نے مدون فرمایا ہے اور جن کا نفاذ حضرات مشائخ کی صحبت میں ہوتا ہے اور یہی راز ہے بعیت و خدمت مشائخ کا تو یہ شخص فطری طور پر خاندانی اثر سے خسیس و دنی ہے اور صحبت کا اتفاق ابھی ہوا نہیں اور نری تعلیم اس کے لیے کافی نہیں تو اب لامحالہ اس شخص میں یہ رذائل موجود ہوں گے اور وقتاً فوقتاً اس کے افعال میں ان اخلاق رذیلہ کے آثار ظاہر ہوں گے۔ اب دیکھنے والے ان کو دیکھ کر تمام اہل علم کو ان پر قیاس کر کے سب پہ ایک حکم لگاتے ہیں ان کے مقابل ان اہل علم کو کیوں نہیں دیکھتے جو خاندان سے عالی ہیں یا فطرۃً حلیم ہیں یا صحبت نے ان کو درست کر دیا ہے ان کو دیکھیں تو

معلوم ہو جائے کہ ان رذائل کے اسباب دوسرے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ
اس وقت چونکہ عالی خاندان لوگوں نے سرتاپا انگریزی کو اوڑھنا بچھونا
بنا لیا ہے اور عربی کثرت سے ایسے ہی لوگ پڑھنے لگے جو خاندان سے
دنی دناءت میں رہنے کے سبب صحبت و تہذیب سے عاری اور اسباب
تہذیب ابھی مجتمع نہیں ہوئے تو لامحالہ بہت سے لوگ ایسے ہی نظر آوینگے
بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین نے کسقدر اُن کو مہذب بنا دیا ہے۔ اگر علم دین
بھی نہ ہوتا تو اور زیادہ بے تہذیب ہوتے جیسا کہ ان لوگوں میں بے علموں کو
دیکھا جاتا ہے تو علم دین نے پھر بھی کچھ نہ کچھ تہذیب ہی کی ہے۔ بس علم
دین کا اثر بے تہذیبی ہونا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایسی طبیعت کے لوگ
انگریزی پڑھتے تو ان سے بھی زیادہ رذائل اُن میں پائے جاتے۔ کیونکہ علوم
دینیہ میں تعلیم تو ہے تہذیب کی وہاں تو یہ بھی نہیں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی
معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس الزام کا زیادہ مورد معزز اصحاب کا طبقہ ہے۔
ان کے اعراض کے سبب دوسرے خاندان کے لوگ اہل علم میں زیادہ پائے
گئے۔ ان کو دیکھ کر بقاعدہ للاکثر حکم الکل سب پر یہ گمان ہوا۔ اگر یہ خاندانی
لوگ علوم دینیہ کی طرف توجہ کرتے اور اپنی اولاد کو اس میں کامل بناتے تو
کثرت سے علماء ان میں پائے جاتے اور بوجہ علو خاندان کے ان میں فضائل
طبعیہ زیادہ ہوتے اور رذائل مذکورہ مفقود ہوتے تو جب اکثر علماء ایسے
نظر آتے تو للاکثر حکم الکل کے قاعدے سے علماء کو جامع فضائل اخلاقیہ سمجھا
جاتا اور علم دین پر اس اثر کا گمان نہ ہوتا۔ چنانچہ جو علماء خاندانی ہیں بعض

خصوص اگر اُن کو اہل طریق کی صحبت میسر ہو گئی ان میں تو کیسے کو پست خیال کم ہمت تنگ چشم دکھلائیے گو کپڑے اور سامان ان کے پاس امیرانہ نہ ہوں مگر اس میں بھی شان ان کی یہ ہے ؎

مبین حقیر گدایانِ عشق را کایں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہند

؎ گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

؎ موحد چہ بر پائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس
ہمیں ست بنیاد توحید و بس

بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ بدون علم دین کے فضائل اخلاقیہ سیر چشمی و بلندی نظری و عالی دماغی و تہذیب و اعتدال افعال و انتظام اقوال میسر ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ بے علم امراء میں ان اخلاق کا کہیں نام بھی نہیں ہوتا۔ لیکن مال کی بدولت خوشامدیوں کا اجتماع رہتا ہے اور وہ تحسین کرتے رہتے ہیں اس لئے اُن عیوب پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ بقول مولانا رحمۃ اللہ علیہ ع

خواجہ را مال ست و مالش عیب پوش

لیکن محققین کی نظر میں وہ پردہ ساتر نہیں۔ وہ اس حالت میں بھی اُنکو قابل قدر نہیں سمجھتے بلکہ بعض اخلاق تو ایسے مذموم ہوتے ہیں کہ عوام بھی نفرت کرتے ہیں مگر ڈر کے مارے کچھ کہہ نہیں سکتے اور بعض اوقات پیچھے کہتے بھی ہیں اور جس روز یہ پردہ اٹھ جائے گا۔ کما قال اللہ تعالےٰ

فکشفنا عنک غطائک اس روز سب حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ قال اللہ تعالیٰ یوم تبلی السرائر۔ وقیل ؎

فسوف تری اذا انکشف الغبار
افرس تحت رجلک ام حمار

پس بفضلہ تعالیٰ اس شبہ کا کہ علم دین سے بعض اخلاق رذیلہ پیدا ہوتے ہیں بالکلیہ قلع و قمع ہو گیا

باب اوّل کی تیسری فصل

کے بعض اجزاء کی ضروری توضیح و تفریع

صفات دینیہ مذکورہ فصل بالا میں سے بعض کا جو شبہ اہل علم میں ہو جاتا ہے۔ منشاء اشتباہ اُن کا بعض واقعات جزئیہ ہیں جن کے عمق تک نظر نہ کرنے سے معترضین کو غلطی واقع ہو جاتی ہے۔

مثلاً بعض طلباء و علماء کو دیکھا جاتا ہے کہ لکھے ہوئے لفافے دوسری طرف سے اُلٹ کر گوند سے جوڑ کر کام میں لے آتے ہیں لوگ اس کو دناءت و خست سمجھتے ہیں۔ حالانکہ غور کر کے دیکھا جاوے تو حقیقت اس کی مال کو اضاعت سے بچانا ہے۔ گو اس درجہ تک کی حفاظت واجب نہ ہو لیکن محمود اور اولیٰ ہونے میں تو شبہ ہی نہیں۔ متمدن اقوام کی عموماً اس پر مدح کی جاتی ہے کہ کوئی چیز بیکار نہیں چھوڑتے۔ ہر چیز سے گو وہ کیسی ہی ناکارہ

نظر آوے کام لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ چیتھڑے گودڑوں کا کاغذ بنتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تعجب ہے کہ اس پر تو مدح ہو اور اس کی نظیر پر خردہ گیری کی جاوے نہایت ہی انصاف سے بعید ہے۔ اور مثلاً بعض اہل علم جب اپنے نام کے آئے ہوئے خطوط میں ایک سادہ کاغذ جڑا ہوا دیکھتے ہیں جسکا آج کل عام رواج ہو گیا ہے تو وہ اس کو جدا کر کے رکھ لیتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں۔ اس میں بھی اعتراض کی اور جواب کی تقریر مثل مثال اول کے ہے۔ اتنا فرق ہے کہ اوپر کا فعل واجب نہ تھا اور یہ واجب ہے کیونکہ اوپر کی صورت میں لفافہ سے انتفاع تو ہو چکا ہے تو تکرر انتفاع کا اہتمام نہ ہونا اضاعت منہی عنہا نہیں ہے اور یہاں اس کوتل کاغذ سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا گیا تو اس سے کام نہ لینا بالکلیہ اضاعت مال ہے جس سے نہی آئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعت المال۔ الحدیث اور اس کے مقابلے میں ان کوتل کاغذ لگانے والوں کو بلا شک وشبہ مسرف ومبذر کا لقب دیا جاوے گا اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ چھدام کے کاغذ میں کیا اسراف ہو گا۔ اہل قانون خوب جانتے ہیں کہ جب غبن جرم ہے تو ہزار روپے کا غبن جیسا جرم ہے ویسا ہی ایک پائی کا غبن بھی جرم ہے۔ اور اس کا مرتکب بھی اسی طرح مستحق سزائے فوجداری کا ہوتا ہے جیسا کہ زیادہ غبن کا مرتکب۔ پھر کیا وجہ کہ قانون شرعی میں چھدام کے کاغذ کے برباد کرنے کو جرم اسراف میں داخل کرنے پر تعجب کیا جاوے۔

تنبیہ: بعض مدارس اسلامیہ میں بھی اس کا رواج ہو چلا ہے احتیاط

واجب ہے۔ فقط

اور مثلاً بعض اہل علم پیسہ پیسہ کو سمجھ کر سوچ کر اٹھاتے ہیں۔ ہر چیز کم خرچ کرتے ہیں۔ بے دریغ خرچ نہیں کرتے اس سے بخیل مشہور کردئیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بطور لطیفہ کے مشہور ہے کہ مولوی لوگ تو پہلے ہی صرف نحو پڑھ لیتے ہیں (یہ نحو خرابی ہے نحو کی) مگر اس کو بخل سمجھنے والوں کیحالت یقیناً مصداق ہے اس مصرعہ کی۔ ع

حفظت شیئاً و غابت عنك اشیاء

یعنی ان کا ایک نوع کا واقعہ تو دیکھا کہ وہ کفایت شعاری کرتے ہیں مگر اور تین نوع کے واقعے اس سے زیادہ مہتم بالشان نہ دیکھے۔ ایک تو یہ کہ جہاں اپنے پیسہ پیسہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہاں دوسرے کی ایک ایک کوڑی کا پاس کرتے ہیں یعنی ایک کوڑی کسی کی اپنے پاس رہ جانا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ ایک ایک پیسہ کے لقطہ کے مالک کو سخت اہتمام سے تلاش کرتے ہیں۔

ہمارے ایک بزرگ اتفاق سے کبھی مدرسہ میں بیٹھ کر کوئی اپنا خط لکھ لیتے حالانکہ متولی رقم کے لیے ایسے استعمالات میں تنگی نہیں مگر وہ اسکو کبھی گوارا نہ فرماتے اور خط لکھنے کے بعد ایک پیسہ مدرسہ میں داخل فرمادیتے کہ مدرسہ کی روشنائی خرچ ہوئی ہے۔ ہم نے بعض کو دیکھا ہے کہ انہوں نے خط کا یا اس سے کم تعویذ کا کاغذ مانگا اور کسی نے حاضر کیا اور معلوم ہوگیا کہ کسی نابالغ بچہ کی ملک ہے تو ہرگز نہیں لیا واپس کردیا۔ تو اگر ان کو پیسہ سے محبت ہوتی تو ایسے استعمالات سے کیوں احتیاط کرتے حب مال کے لئے تو حرص و طمع

لازم ہے اس سے معلوم ہوا کہ بخل اور حب مال اسکا سبب نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ کی نعمت کی قدر کرتے ہیں۔ اور حقیقت حقوق کی سمجھتے ہیں اور حدود شرعیہ و عقلیہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ دوسرا واقعہ یہ کہ جہاں ایک ایک پیسہ سوچ کر دیتے ہیں وہاں جس جگہ خرچ کرنا شرعاً یا عقلاً ضروری ہو وہاں ہزاروں روپیہ کو ایک خس کے برابر نہیں سمجھتے۔ اور سب سے زیادہ تقاضہ خرچ کا ان کے قلوب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف میں تردد و توقف کا سبب بخل نہیں ورنہ جو شخص ایک پیسہ میں بخیل ہو گا وہ ہزاروں روپیہ میں کیسے سخی ہو جائے گا۔ بلکہ سبب اس کا یہ ہے کہ علم و عقل اس کے کامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان دونوں کا مقتضا یہ ہے کہ جب تک کسی فعل کی غایت سمجھ میں نہ آوے اس فعل کو نہ کرے۔ پس اسی لئے صرف کرنے کی غایت کو بھی وہ سمجھنا چاہتا ہے جب تک سمجھ میں نہیں آتی خرچ سے رکتا ہے اور جب سمجھ میں آجاتی ہے سب سے زیادہ خرچ کرنے والا یہی ہوتا ہے۔ رہا یہ کہ بے علم اور دنیادار بھی تو کچھ غایت سمجھ ہی لیتے ہیں۔ کیونکہ بدون اس کے تو صدور فعل اختیاری کا محال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غایت ایسی دقیق نہیں جس میں تامل سے کام لیا جاوے۔ پھر اہل علم صرف سے کیوں رکتے ہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اہل دنیا کے نزدیک جو غایت ہے وہ ان صاحبوں کے نزدیک غایت ہی نہیں یعنی نام و نمود و شہرت و تفاخر وغیرہ۔ بلکہ غایت وہ ہے جس کے لئے مال موضوع ہے عقلاً و شرعاً۔ سو وہ بعض بعض مواقع پر دقیق و غامض ہوتی ہے کہ اس میں تامل سے کام لیا جاتا ہے۔

تیسرا واقعہ یہ کہ جہاں صرف میں کمی کرتے ہیں تحصیل میں بھی کمی کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں کہ ان کو زیادہ ملتا ہی نہیں۔ ہمارے چشم دید واقعات ہیں کہ انکو بہت بہت ملتا ہے اور وہ عذر وانکار کر دیتے ہیں کہ ہمارے پاس کافی ہے زیادہ کیا کریں گے۔ نیز اگر اتفاق سے اُن کے پاس زیادہ سامان ہو جاتا ہے وہ اُس سے متوحش ہو کر اپنے پاس سے جدا کر دیتے ہیں۔ کسی جگہ تھوڑی تنخواہ ملتی ہے اور دوسری جگہ سے زیادہ پر بلائے جاتے ہیں مگر نہیں جاتے کہ زیادہ کیا کرنا ہے تو کیا یہ بخل کے آثار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاقل ہیں۔ ہر شے میں ضرورت پر نظر ہے۔ آمدنی میں بھی خرچ میں بھی۔ اور کوئی شخص یہ شبہ نہ کرے کہ اخیر کا واقعہ تو ظاہری مولویوں میں نہیں دیکھا جاتا۔ صرف درویشوں کے ساتھ خاص ہے سو اول تو پہلے دو واقعے ہی جواب کے لئے کافی ہیں تیسرا نہ سہی۔ دوسرے مولوی سے مراد عالم باعمل ہے۔ آپ اُس کا نام درویش رکھ لیجئے جو ایسا نہ ہو وہ ہمارے نزدیک مولویوں داخل نہیں۔ صرف لفاظ ہے۔ ہم صرف عربی زبان جاننے والے کو مولوی نہیں کہتے ہیں۔ مصر اور بیروت میں بہت عیسائی اور یہودی عربی دان ہیں تو کیا ہم ان کو مقتدائے دین کہیں گے اور یہاں ہی سے جواب ہو گیا۔ ایک دوسرے شبہہ کا بھی کہ بعضے مولوی اول کے دو واقعے سے بھی معرا ہوتے ہیں۔ پرائے مال میں ذرا احتیاط نہیں کرتے دوسرے کے حقوق کو ٹالتے ہیں۔ کسی کی کتاب لے کر نہیں دیتے یا بے پروائی سے ضائع کر دیتے ہیں سو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ یہ سب اقتضائے علم کے خلاف ہے۔ ایسا شخص ہمارے نزدیک علماء میں داخل نہیں پھر یہ کہ جس شخص میں یہ بے احتیاطیاں ہوتی ہیں۔ اکثر انکو حقوق

سے دو پیے بھی نہیں دیکھا وہ اُن میں لااُبالی ہوئے ہیں۔ اُن میں بخل کا شبہہ ہی نہیں واقع ہوتا جو جواب دیا جائے۔ گو اُس سے بڑھکر اُس میں عیب ہو یعنی عدم مبالات فی الحق الواجب۔ مگر اس وقت کلام شبہہ بخل میں ہے

اسی شبہہ بخل کی ایک فرع ہے۔ بعضے مولویوں کا بہت باریک قلم سے کارڈ پر بہت سی عبارت لکھ دینا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا واقعہ اُس کے جواب کے لئے کافی ہے وہ یہ کہ جس جگہ مخالفت قانون کے سبب شریعت اجازت نہیں دیتی وہاں ایک حرف لکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مثلاً ایک طالب علم کا ارادہ کسی دوست کو اپنی خیریت کا ایک کارڈ لکھنے کا تھا جو اُس کے پاس سے ابھی دوسرے شہر چلا گیا تھا۔ اتنے میں ڈاکیہ آیا اور اُس نے اسی دوست کے نام کا ایک کارڈ جو اس طالب علم کی معرفت تھا اُس کو دیا اور اُس کے موجود نہ ہونے کی اطلاع پر ڈاکیہ نے درخواست کی کہ آپ اس کا پتہ بدل کر ڈاک میں چھوڑ دیجئے اب میدان خالی ہے اور یہ طالب علم قادر ہے کہ اسی کارڈ کے بین السطور میں اپنی خیریت لکھدے اور ڈاک میں چھوڑ آئے اور اس طرح سے اس کا کارڈ بچ جائے۔ لیکن چونکہ قانون سے یہ ممنوع ہے اور ان مسائل میں قانون کے خلاف کرنا شرعاً جائز نہیں اس لئے یہ شخص کبھی ایسا نہ کرے گا۔

اسی طرح بہت دفعہ خود میرے پاس ایسے خطوط آجاتے ہیں جن کا ٹکٹ ڈاک خانہ کی مہر سے صاف بچ جاتا ہے میں اس خط کے پڑھنے سے بھی پہلے یہ کام کرتا ہوں کہ اُس ٹکٹ کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ حالانکہ اگر کوئی اسکا استعمال کرے تو کسی کو پتہ بھی نہ چلے مگر دین اس کی اجازت نہیں دیتا اسلئے

ایسا نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح سب اہل علم اس تدین پر عمل کرتے ہیں۔ ان واقعات سے ہر عاقل اندازہ کر سکتا ہے کہ کارڈ پہ باریک قلم سے لکھنے کا سبب بخل نہیں ہے ورنہ دوسرے مواقع پر آثار اس بخل کے کیوں نہیں ظاہر ہوتے بلکہ منشاء اسکا بلا ضرورت زیادہ صرف کرنا ہے جو عین مقتضائے دانشمندی ہے۔ البتہ اس کے امثال میں اتنا غلو کرنا کہ نگاہ پہ زور پڑے یا وقت زیادہ صرف ہو جس میں دوسرا ضروری اور مفید کام کر سکتا تھا یہ بے شک مذموم ہے کہ دھیلہ کا تو فائدہ کیا اور نگاہ اور وقت کا کہ لاکھوں روپے کی چیز ہیں نقصان کیا۔ اور مثلاً اکثر وضع و لباس اہل علم کا سادہ اور کبھی اپنے گھر کا دھلا ہوا اور کبھی پیوند وغیرہ لگا ہوا۔ کبھی بند یا بٹن کھلا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ اس سے ان پر تذلل کا شبہ کیا جاتا ہے لیکن اس شبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تذلل کی حقیقت ہی یہ حضرات نہیں سمجھے۔ جو تواضع کو تذلل سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عزت کا مدار استغنا اور تذلل کا مدار اظہار احتیاج ہے۔ لباس و وضع کو اس میں اصلاً دخل نہیں۔ اگر کپڑے پرانے ہوں مگر ہفت اقلیم کے سلطان کا بھی دست نگر نہیں وہ معزز ہے اور اگر لباس و وضع نوابوں کا سا ہے۔ ہزار روپے تنخواہ ہے۔ ہزار روپیہ جائداد کی آمدنی ہے۔ سامان امیرانہ بھرا ہے۔ مگر نظر اس پر ہے کہ اس مقدمہ میں کچھ مل جاوے۔ فلاں معاملہ میں کچھ ہاتھ آجاوے جو کہ رشوت ہے۔ وہ شخص بالکل ذلیل ہے۔ پس اہل علم کی یہ وضع تو محض تواضع کے سبب ہے کہ اپنے کو بڑا آدمی نہیں سمجھتے اور یہی بڑائی کی علامت ہے اور کبھی غایت مشغولی مہمات امور عظام میں اسکا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ اور امر طبعی ہے کہ جو شخص کسی

مہتم بالشان اور جلیل القدر کام میں منہمک و مستغرق ہوگا۔ اُس کو اپنی تن آرائی اور شکم پُرکی کی فرصت بھی نہ ملے گی۔ چنانچہ تقریبات کے مہتممین اور سرکاری وقتی خدمات کے منتظمین کی حالت دیکھی جاتی ہے کہ وقت پر کھانا بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی کئی روز کپڑے بھی بدلنے میں نہیں آتے۔ کیا یہ تذلل ہے بلکہ غایت عزت ہے کہ اپنے منصبی فرض کو کس اہتمام سے انجام دے رہا ہے اسی طرح تجربہ ہے کہ ریفارمر اور مصلح جس درجے خدمت اصلاح میں مستغرق ہوگا اسی درجہ اُس کو اپنے تن بدن سے بے التفاتی ہوگی سو یہ صفت تو قابل قدر ہے نہ کہ محل اعتراض اور مثلاً یہ کہ اکثر طالب علموں کے حجروں میں کوڑے کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اُس کو صاف کرلیں یہ بھی غایت کم ہمتی ہے۔ اس شبہ میں کچھ واقعیت ضرور ہے مگر منشا صرف اس کا کم ہمتی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک دوسری بات بھی ہے یعنی انہماک تحصیل علوم میں کہ اُن کو ایسے جزئیات کے لیے نہ وقت ملتا ہے نہ اُسطرف توجہ ہوتی ہے اگر کم ہمت ہوتے تو رات رات بھر کیسے جاگتے۔ کوئی دوسرا جاگ کر تو دکھلا دے۔ اگر کم ہمت ہوتے تو دھوپ میں بڑی بڑی مسافتیں طلب علم کے لیے کیسے قطع کرتے۔ فقر و فاقے کیسے جھیلتے کیا یہ علامتیں کم ہمتی کی ہیں اور یہ نہ سمجھا جاوے کہ یہ تحمل اضطراری ہے۔ ہرگز نہیں اسکی زندہ نظیریں موجود ہیں کہ ان کو اس حالت میں آرام کی نوکری مختصر تعلیم کی ملتی ہے تنخواہ بھی اچھی ہے قدر و منزلت بھی خوب ہے۔ آسائش کا سامان بھی ہے مگر علوم میں ترقی نہیں بس اتنی بات پر تمام عیش پر خاک ڈال کر دیوانوں کی طرح بے سر و سامانی میں ایک مدرسہ کو قبلۂ توجہ بنا کر چل کھڑا ہوا اور مہینہ بھر میں

پاؤں میں آبلے لے کر مدرسہ پہونچا اور چار مہینے وہاں فاقہ کی مصیبت اٹھائی مگر بہ زبان حال نہایت استقلال کے ساتھ نوا سنج ہے کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

صاحبو! یہ شخص قومی انجن کا ڈرائیور ہے۔ ڈرائیور کو غسل اور صابون ملنے کی اور کوئلوں کی جھاڑنے کی فرصت کہاں۔ اگر فرسٹ و سکنڈ کلاس کے متنعم اس پر اعتراض کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم ولایت اسیکی بدولت پہونچے ہیں اور وہاں سے ڈگریاں حاصل کر کے فرسٹ و سکنڈ کا سفر کر رہے ہیں تو نادانی نہیں ہے تو کیا ہے۔ مگر یہ ڈرائیور نہایت متانت سے اُن کے سب اعتراضوں کے جواب میں اتنا کہہ دیتا ہے ؎

کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

اور جتنی کم ہمتی ہے اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اپنا اصلی کام اُنکو اسقدر تھکا دیتا ہے کہ پھر آرام کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ حالت انگریزی طالب علموں کو بھی پیش آتی ہے مگر وہ اکثر خوشحال ہوتے ہیں۔ اُن کے نوکر چاکر ایسے کام کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ عالی ہمت نظر آتے ہیں۔ اور طالب علموں کو سر دھوئے ہوئے یا غسل کئے ہوئے بہت بہت زمانہ گذر جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں صفائی نہیں رہتی۔ اس کے متعلق بھی بحث اور تحقیق ہمنا متثل ادب کے ہے اور تعیین منشا مذکورہ کا مؤید ایک واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ ہم نے بکثرت دیکھا ہے کہ جو طلبا مسکن اور ملبس کی تزئین میں زیادہ رہتے

ہیں وہ کمائی سے محروم رہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ منشاء اس کا انہماک فی المقصود تھا۔ جب توجہ تزئین کی طرف ہوئی تو مقصود ہیں مشغولی نہ ہوگی اُسکے لئے حرمان لازم ہے۔ البتہ لطافت کا بالکل اہمال خود خلاف شرع ہے اسلیئے اس کا انتظام بقدر ضرورت ضروری ہے اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ منتظم مدرسہ خواہ بذریعۂ ملازم یا خود طلباء کو تصریحاً حکم دے کر اپنی نگرانی میں ہفتہ وار ضروری صفائی کرادیا کرے اور مثلاً اہل علم کے افعال منضبط کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ طالب علموں کا بیڈھنگا پن تمامی انتظامی امور میں دیکھا جاتا ہے۔ اس اعتراض میں بھی کچھ واقعیت ضرور ہے مگر واقعیت کے ساتھ غلو بھی ہے اس کی تحقیق منشا رکی اور اس کا انسداد مثل بالا کے ہے اور ایک سبب ان اخیر کی مذکورہ کوتاہیوں کا یہ بھی ہے کہ بکثرت طالب علم خاندان سے گرے ہوئے ہیں اور سلیقہ کی کمی اُن میں عام ہے۔ پھر جو خاندانی اُن میں ملجاتا ہے بحکم الغلبۃ للاکثر وہ بھی اُن کا ہمرنگ ہوجاتا ہے۔ پس ذمہ دار ان کوتاہیوں کا علم دین نہیں ہے۔ بلکہ خاندان اور صحبت کی کمی ہے۔

چوتھی فصل

تیسری فصل میں دنیا داروں کے وہ شبہات تھے جو ایسے اخلاق کے متعلق ہیں جن کا دوسرے سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ان کے بعض شبہات وہ ہیں جو ایسے اخلاق کے متعلق ہیں جن کا دوسروں سے تعلق ہے۔ اس فصل میں ان کا بیان ہے پس اہل علم کی نسبت بعض کا یہ اعتراض ہے کہ اکثر

اہل علم کو دیکھا جاتا ہے کہ سوال کے وقت غصہ کرتے ہیں جس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں یا تو جواب نہیں آتا یا تعصب کا غلبہ اُن کو جوش میں لاتا ہے چنانچہ اُس کے بعض اور بھی آثار پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی بات پر اصرار کرنا۔ دوسرے کی بات کو سمجھنے کا قصد نہ کرنا۔ اور یہ اعتراض ہے کہ ان میں تہذیب کم ہوتی ہے جس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔ حیا کم ہوتی ہے۔ اور یہ اعتراض ہے کہ ان میں باہم حسد اور نفسانیت ہوتی ہے جس سے دوسروں کو تنگی ہوتی ہے کہ ایک کے پاس جاویں تو دوسرے کی شان میں گستاخی کریں۔ یا نہیں۔ دوسرے کے پاس جا کر پہلے کے لئے یہی معاملہ کریں۔ اور یہ اعتراض ہے کہ ان میں جواب خطوط کی پابندی نہیں ہوتی۔ دوسرے کو تکلیف انتظار کی ہوتی ہے۔ اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ یہ شبہہ عربی خوانوں کے ساتھ کیوں مخصوص کیا جاتا ہے۔ انگریزی کے فاضلوں میں یہ اخلاق بدرجہا زائد مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ذرا خلاف مزاج بات ہو جائے غصہ سے بیخود ہو جاتے ہیں۔ سخن پروری بو جہ کبر کے بہت کچھ کرتے ہیں۔ تہذیب کی کمی تو ایسا امر مشاہد ہے جس میں بیان ہی کی حاجت نہیں۔ جس کی طرف چاہا پشت کر لی جس کی طرف چاہا پاؤں مع جوتوں کے پھیلا دیا۔ بزرگوں کا ذرا ادب نہیں کیا جاتا۔ ماں باپ کے ساتھ مساوات بلکہ تحقیر کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا بے حیائی ہوگی۔ حسد اور نفسانیت ملکی نوکریوں میں ایک عہدہ جلیلہ کے طالب کئی ہوں گو اُس پر تنخواہ بھی نہ ملے قابل دیکھنے کے ہے جس سے نفس کو قابل خطاب نہیں سمجھتے اس کا خط بے پڑھے ہی اگرچہ اس میں ٹکٹ بھی ہو پھاڑ کر

ہنسی میں ڈال دیا جاتا ہے پھر اس میں عربی کی کیا تخصیص ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اگر اہل علم میں ان اخلاق کا کوئی اثر ہے اکثر منشاء اس کا دین ہے اور ان اہل ترقی میں جتنا کچھ اثر ہے منشاء اس کا دنیا ہے۔ مثلاً مولویوں کو دین کی بات پر غصہ آوے گا اور ان حضرات کو دنیا کی بات پر آوے گا۔ چونکہ دین کی خود وقعت ہی ان کے قلب میں نہیں اس کے لئے ان کو جوش بھی نہیں آتا اس سے اپنے کو حلیم اور مولویوں کو تند خو قرار دیا ہے۔ و علیٰ ہٰذا اور امور اعتراضیہ میں بھی یہ تو جواب الزامی تھا۔

اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ یہ شبہ بالکل غلط ہے کہ علماء کو نفس سوال پر غصہ آتا ہے۔ جو شخص ان کی صحبت طویلہ اختیار کرے اس کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت سوال میں کتنا غصہ کرتے ہیں۔ غصہ اگر آتا ہے تو وہ دوسری بات پر آتا ہے۔ وہ یہ کہ سوال ایک تو بطور استفادہ کے ہوتا ہے یعنی سچ مچ کسی شبہ کا دفع ہی کرنا ہے اور وہ سوال کبھی عرض کا ہے اس پر تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ کوئی شخص کسی عالم کا غصہ کرنا ایک جگہ بھی ثابت نہیں کر سکتا اور ایک سوال بطور تعنت یا تمسخر و مشغلہ یا محض اعتراض و الزام کے ہوتا ہے چونکہ اس میں شریعت کی توہین ہوتی ہے تو جس کے دل میں شریعت کی عظمت ہوگی وہ اس توہین کو کب گوارا کرے گا۔ اور اس ناگواری کے سبب اس کو غصہ کیسے نہ آوے گا۔ اسی طرح بعض اوقات سوال میں مخاطب کی اہانت ہوتی ہے اس پر ناگواری بھی امر طبعی ہے اور مذموم نہیں۔ اسی طرح اگر فضولی سوال کیا یا فضول ہونے کے ساتھ

سائل کے فہم کے لائق بھی نہ ہوا اور سائل اس سمجھانے پر بھی کہ یہ سوال لایعنی ہے باز نہ آیا۔ تو اس وقت غصہ آجانا طبع سلیم کا مقتضا ہے جو کہ بجائے خود ایک کمال مطلوب ہے۔ چنانچہ سید العلماء والحکماء حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود بعضے لایعنی سوالوں پر غصہ فرمانا احادیث کثیرہ میں وارد ہے۔ کیا اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرے یا عدالت سے کچھ فضول سوال کرے مثلاً ادنیٰ سی بات ہے کہ درخواست پر ٹکٹ لگانا اس کی نسبت پوچھنے لگے کہ ایسا قانون کیوں مقرر کیا گیا۔ درخواست بلا ٹکٹ کیوں نہیں لی جاتی یا اس فیس سے نصف فیس کیوں نہ مقرر ہوئی کیا توہین کو جرم اور اس فضول سوال کو ناگوار اور اگر باز نہ آئے تو کیا موجب غضب حاکم نہ کہا جاوے گا۔ کیا اس غضب کو اخلاق رذیلہ میں داخل کرینگے۔ پھر کیا ایک عالم شریعت کو اہانت شریعت پر یا فضول سوال کے اصرار پر چشم نمائی یا زجر کا بھی حق حاصل نہیں اور کیا اس کو اخلاق رذیلہ میں شمار کیا جائے گا یا افعال حمیدہ ہیں۔

رہا تعصب اور عجز عن الجواب سو اول تو جب غصہ کا مبنی بتلا دیا گیا تو ان میں مبنی ہونے کا شبہہ ہی نہ رہا۔ لیکن اگر ان کو کوئی شخص مستقل شبہہ قرار دیں تو جواب تعصب کا یہ ہے کہ اول تعصب کی حقیقت کو سمجھنا چاہیئے تاکہ اس سے اعتراض کے صحیح غلط ہونے کا اندازہ ہو سکے سو تعصب کے معنے ہیں ناحق کی پچ کرنا۔ پس کسی پر تعصب کا حکم لگانا موقوف اس پر ہے کہ پہلے اس کے دعوے کا باطل ہونا ثابت کیا جائے سو جن مواقع

پر حضرات معترضین اہل علم پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔ اُن میں خود اکثر معترضین ہی متمسک بالباطل ہوتے ہیں اور اہل علم کو ابطال باطل پر متعصب قرار دیتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ اس صورت میں معترضین ہی متعصب کہلانے کے مستحق ہونگے اور اگر تعصب سے مراد مطلق غضب و تشدد ہے اور مطلق غضب و تشدد کو بھی اخلاق رذیلہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ سو یہ ایک سخت غلطی اور علم اخلاق سے ناواقفی ہے۔ کیا غصہ اور سختی کا کوئی موقع علم اخلاق میں محمود نہیں بتلایا گیا۔ کیا اگر کسی کی عفیفہ ماں کے متعلق براہ شرارت سوال کرے کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپ کی والدہ ایک زمانہ میں چکلہ میں بیٹھا کرتی تھیں تو کیا کوئی شخص ٹھنڈے دل سے اس سوال کو سُنکر ٹھنڈے دل سے اُسکی تغلیط کر کے اُس تغلیط پر دلائل قائم کرے گا۔ یا اگر ایسا کیا تو شرفا اس کو بے غیرت قرار نہ دیں گے یا وہ شخص بیخود ہو جاوے گا اور غضب و شدت کو کام میں لاوے گا اور عقلا کے نزدیک وہ غیور اور باحمیت قرار دیا جاویگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غضب کی جگہ غضب محمود ہے۔ حکما کا قول ہے ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو فاصد کہ جراح و مرہم نہ است

تعجب ہے کہ بالفرض لئے تو اگر وہ واقعہ میں کبھی ایسی رہی بھی ہو بیتاب ہو جانا اخلاق حمیدہ میں داخل ہو اور دین کے لئے اُسپر اعتراض تعن کرے حالانکہ وہ واقع میں قابل اعتراض بھی نہیں ذرا متغیر ہو جانا اخلاق رذیلہ میں داخل ہو۔ خاصکر جبکہ معترض مسلمان بھی ہو اُسکی اور زیادہ شکایت پیدا

ہوکر زیادہ تغیر ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار سے مناظرہ کرنے کے وقت
میں اعتراض سُن کر اتنا غصہ نہیں آتا بلکہ اگر واقعات کو تتبع کیا جائے تو جتنا
ماں کی گالیاں سننے والا بیتاب ہوجاتا ہے اہل علم باوجود اس کے کہ ماں سے
زیادہ دین انکو پیارا ہے اور ماں میں تو احتمال لوث کا ہوسکتا ہے اور دین میں
یہ احتمال ہی نہیں اور اس حیثیت سے اہل علم کو حق تھا کہ دین کے متعلق کچھ
بیہودگی سُن کر اُس شخص سے زیادہ بیتاب ہوجاتے۔ مگر پھر بھی وہ بہت ضبط
کرتے ہیں اور بجز تیزی لہجہ کے کوئی نا ملائم لفظ اُن کے منہ سے نہیں نکلتا اس
سے زیادہ صبر و تحمل کیا ہوگا۔ انصاف شرط ہے۔ رہا عجز عن الجواب سو کہیں
تو سوال جہالت کا ہوتا ہے اُس کے لئے حکماء کا قول ہے **مصرع** جواب
جاہلاں باشد خموشی ؎ اور کہیں سائل کے فہم سے برتر ہوتا ہے اُس کے
لئے حکماء کا یہ قول ہے ؎

فہم سخن تا نکند مستمع
قوت طبع از متکلم مجوئے

کیا اگر آپ سے آپ کا سائیس درخواست کرے کہ مجکو اقلیدس
کے پہلے مقالہ کی پانچویں شکل جو مامونی کہلاتی ہے اس طرح سمجھادو کہ نہ
اُس میں اشکال سابقہ کا حوالہ ہو اور نہ اُصول موضوعہ و علوم متعارفہ کا تو
کیا آپ اس کو سمجھانے بیٹھ جاوینگے یا یہ فرماوینگے کہ بھائی یہ تیری سمجھ سے
باہر ہے اور اگر وہ پھر بھی اصرار کرے تو کیا آپ اُس کو گدھا اُلو نہ کہنے لگینگے
اور کیا ایسا کرنے سے آپ کو کوئی شخص عاجز عن الجواب کہے گا یا عین حکمت۔

پر عمل کرنے والا کہا جاویگا۔ البتہ جیسا اُسی مجلس میں کوئی طالب علم اقلیدس کا فرض کیجئے اُسی شکل کو سمجھنے آجاوے تو اُس وقت آپ کی زبان فوراً کھل جاوے گی۔ اسی طرح اگر اُسی مجلس میں کوئی طالب علم اس مسئلے کے متعلق پوچھنے آجاوے اُس وقت دیکھ لیا جاوے کہ علماء کیا کیا جواہر تحقیقات کے نثار کرتے ہیں اور پہلا سائل اُن تحقیقات کو اُس وقت سُن کر یہ بھی اندازہ کرلے گا کہ حقیقت میں یہ میرے فہم سے بالاتر تھا اور اس کے اعراض وسکوت کی وجہ بھی سمجھ لیگا کہ اس شعر کا مصداق ہے ؎

ہر کہ او از ہمزبانی شد جُدا

بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

اور اس شعر کے مدلول کا مشاہدہ کرلے گا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ برون اُفتد راز

ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست

اور شبہہ کی تقریر میں جو بعض آثار تعصب کے بیان کیے گئے ہیں کہ اپنی بات پر اصرار کرنا اور دوسرے کی بات کو سمجھنے کا قصد نہ کرنا سو اگر وہ بات حق ہے تب تو حق پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا اور اُس کے مقابلہ میں لغو باتوں کی طرف التفات نہ کرنا عین مطلوب ہے پھر اُسکو تعصب سے کیا علاقہ اور اگر وہ بات باطل ہے تو اس اعتراض کا عموماً علماء کو مورد بنانا محض ناواقفی اور قلت اختلاط مع العلماء ہے اور اگر بعض کی نسبت ایسا حکم کیا جاتا ہے تو ہم بھی اس کا انکار نہیں کرتے لیکن

اس کا سبب علم دین نہیں بلکہ علم کے ساتھ تربیت نہ ہونا ہے کہ وہ بھی ایک قسم کی علم کی کمی ہے تو قلت علم اس کا سبب ہوا نہ کہ علم۔

ایک شبہ یہ تھا کہ اہل علم میں تہذیب کم ہوتی ہے۔ اس میں بھی اول تہذیب کا کوئی معیار قرار دیجئے سو تصحیح خیالات و حالات معترضین سے معلوم ہوتا ہے کہ معیار تہذیب کا آج کل یورپ کا رسم و رواج سمجھا گیا ہے سو خود اس معیار کے صحیح ہونے ہی کی کون دلیل ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اہل یورپ کی کوئی رسم تہذیب سے گری ہوئی نہیں۔ کیا خود بعض اہل یورپ اپنی قوم کی بعض رسوم کو قبیح نہیں بتلاتے اور کیا ان سے تنگ نہیں کیا غیر مردوں سے ہاتھ ملانے اور ہنسنے بولنے کی رسم کو بھی خلاف تہذیب نہ کہا جاوے گا۔ وعلیٰ ہٰذا۔ اور بہت سی رسوم و عادات۔ پس معلوم کہ محض یورپ کی رسم کو معیار تہذیب قرار دینا باطل محض ہے۔ پھر وہ معیار کیا ہے سو وہ دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں یا عقل سلیم یا کوئی مذہب صحیح۔ مگر سلیم ہونے کے لئے پھر کسی معیار کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ عقول خود متفاوت ہیں۔ پس معیار ہونے کی صلاحیت صرف مذہب صحیح میں ہو سکتی ہے کیونکہ اسکی صحت پر دلالت قطعیہ قائم ہیں اور مذاہب صحیحہ میں ایسے امور میں ناسخ و منسوخ کا تفاوت و اختلاف بھی نہیں ہو سکتا۔ پس جب معیار تہذیب کا مذہب صحیح اور دین الٰہی قرار پایا تو خلاف تہذیب کا مصداق خلاف دین ہوا۔ اب دیکھ لیجئے کہ دین کے خلاف علماء میں زیادہ افعال و اخلاق پائے جاتے ہیں یا غیر علماء میں۔ اور اسی سے معلوم ہو جاوے گا

کہ بے تہذیب کہلانے کا زیادہ مستحق کون ہے اور اگر کسی میں کوئی امر خلاف تہذیب واقعی پایا جاتا ہے تو اس کا سبب قلت تربیت ہے۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ اسی طرح شبہہ قلت حیا کا ناشی اس سے ہے کہ حقیقت حیا کی تحقیق نہیں کی گئی۔ سو حقیقت اس کی یہ ہے۔ انقباض النفس عما یکرہ۔ اب اس کراہت میں معیار کی ضرورت ہوگی کہ رسم ہے کہ عقل سلیم یا دین صحیح اور مثل بحث تہذیب کے یہاں بھی دین صحیح میں معیار کا انحصار ثابت کیا جاوے گا۔ اس کے بعد آسانی سے فیصلہ ہو جاوے گا کہ حیا کس میں کم ہے۔ لوگ عموماً آج کل علماء کی بے حیائی اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات شرمناک مسائل فقہیہ کھلے کھلے لکھ دیتے ہیں۔ اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ میڈیکل کالج میں عورتوں کو تشریح کی تعلیم دینے میں جتنی بے حیائی ہوتی ہے یہاں تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ یہاں تو صرف الفاظ ہیں اور وہاں ان الفاظ کے معانی کا مصداق۔ مصرع۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

تعجب ہے کہ یہ تو بیحیائی ہو اور گوارا نہ کیا جاوے اور وہ بے حیائی نہ ہو اور گوارا کیا جاوے۔ اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ اگر معترض صاحب ان مسائل کو دین نہیں سمجھتے یا دین کے محفوظ رہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تب تو قبل اس کے کہ مسئلہ مبحوث عنہا میں کلام کیا جاوے۔ اول خود انہی دو مقدموں کو ان کے سامنے ثابت کیا جاوے گا اور اگر اس کو دین بھی جانتے ہیں اور دین کے بقا کو بھی ضروری جانتے ہیں تو ان سے دریافت

کرتا ہوں کہ پیر اعد کوئی طریقہ ان مسائل کے محفوظ رہنے کا ارشاد فرما دیں کہ اس کو اختیار کیا جاوے۔ البتہ آداب دین میں ہم کو یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ زبانی تعلیم میں اگر عورتوں کو ایسے مسائل کا بواسطہ بتلانا ممکن ہو تو بلا واسطہ خطاب نہ کرے سو اہل علم اس کا شدت سے التزام رکھتے ہیں کہ ایسے مسائل بواسطہ اپنی بیبیوں کے بتلاتے ہیں بلکہ احتیاط کے لئے اسوقت ایسے مسائل کے متعلق رسائل دینیہ میں تصریحاً اس مشورہ کو چھاپ بھی دیا گیا ہے کہ شرمناک مسائل لڑکیوں کے درس کے وقت نشان بنا کر چھوڑ دے یا تو مستورات ان کو سمجھا دیں یا بعض مسائل خود وہ سیانی ہو کر سمجھ لیں گی۔ اب بے حیائی کا کیا شبہ رہا۔

ایک شبہ یہ تھا کہ اہل علم میں باہم تحاسد و تنافس دیکھا جاتا ہے سو اس کا مورد اگر عموماً سب علماء کو قرار دیا جائے تو مشاہدہ اس کی تکذیب کرے گا۔ اور بعض کی نسبت کہا جاتا ہے تو ہم بھی اسمیں متفق ہیں لیکن اس کا سبب آیا علم ہے یا قلت تربیت۔ اس کو سمجھ کر پھر اس اعتراض کی صحت و بطلان کو دیکھا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بضرورت تحصیل معاش یا حفاظت خاندان کوئی شخص اپنے بیٹے کے لئے طبیب بننے کو ضروری قرار دیکر اسکا اہتمام کرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اطبائے شہر میں تحاسد و تنافس بھی دیکھے تو کیا محض اس سبب سے وہ اپنی رائے کو بدل دیگا یا رائے کو بحال رکھ کر اس کی کوشش کرے گا کہ میرے بیٹے کے ایسے اخلاق نہ ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی چاہیئے کہ علم دین کا اہتمام کرو اور اخلاق کو درست کرو۔ اور یہ امر کہ ہر جگہ بہو نچکر

دوسرے کے لئے گستاخی کرنا پڑتی ہے۔ یہ کوئی مجبوری نہیں۔ خداوند تعالیٰ ذرا قوتِ تدبیر یہ عطا فرما دے تو بہت سہولت کے ساتھ اس سے بچ سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ خود تو ایسے مضمون کی ابتدا نہ کرے اور اگر صاحب مجلس ایسا کرے تو کچھ جواب نہ دے بلکہ فوراً کوئی مسئلہ پوچھنا شروع کر دے۔ بس یہ شخص محفوظ رہیگا بلکہ خود وہ بزرگ مولوی صاحب چونکہ صاحب علم ہیں اس کو سمجھ جائیں گے اس لئے اپنی حرکت سے شرمندہ ہوں گے۔ غرض یہ ایسے امور نہیں کہ ان کی وجہ سے خود علوم دینیہ سے اعراض یا انقباض اختیار کیا جائے۔

ایک شبہہ یہ تھا کہ خط کا جواب نہیں دیتے اس کا جواب بھی یہی ہے کہ سب پر تو یہ اعتراض غلط ہے۔ آپ اگر کام کرنے والوں کو دیکھیں تو آپ تعجب کریں کہ ایک ایک آدمی اتنا کام کیسے کرتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمۃ اب تک لوگوں کو یاد ہے کہ کس التزام سے خط کا جواب دیتے تھے۔ ایک بار میں نے کچھ سوالات لکھ کر بھیجے تھے اور اس وقت حضرت آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ اسی حالت میں نہایت تکلیف اٹھا کر سب کا جواب لکھا۔ غالباً بیس تیس کے درمیان سوالات کا عدد تھا۔ اور اخیر میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ روایات اس لئے نہیں لکھیں کہ آشوب میں مبتلا ہوں اور نفس جواب بھی چشم بند کر کے لکھتا ہوں اور اگر ایسے جو دگواروں کے پاس سے ...... جواب نہ آوے تو یا تو اصل خط ان کے پاس نہیں پہنچا یا جواب ان کا ضائع ہو گیا یا اصل سوال کے ساتھ جواب کا ٹکٹ نہ گیا ہوگا۔ سو اگر جواب پر ٹکٹ لگا دیں تو کہاں تک لگا دیں۔ مثلاً اگر کسی کے پاس سوا خط روزانہ کا اوسط ہوا چنانچہ

احقر کے پاس اِس اوسط سے کم ڈاک نہیں آتی) اور وہ اپنے پاس سے ٹکٹ لگا۔ ڈیڑھ آنے یومیہ یعنی پندرہ روپے ماہوار خاص اسی مد میں اسکو خرچ کرنا پڑے تو اول تو اہل علم کو اتنی وسعت نہیں۔ پھر اگر کسیکو وسعت بھی ہو تو بہت مشکل ہے جب کہ فرض و واجب بھی نہ ہو اور اگر بیرنگ بھیجیں تو تجربہ ہوا ہے کہ بہت لوگ بیرنگ جواب واپس کر دیتے ہیں۔ بعضے واپس تو نہیں کرتے مگر بدون انتظار جواب اور بلا انتظام ڈاک خود کہیں چل ہی دیتے ہیں۔ جب ڈاکیہ کو نہیں ملتے تو وہاں سے خط واپس آتا ہے اور محصول مضاعف دینا پڑتا ہے۔ اور اگر فرضاً سولہ کے سولہ خط واپس آیا کرے تو دو روپیہ روز یعنی تیس روپے ماہوار اور اگر نصف ہی واپس ہوں تو پندرہ ہی روپے ماہوار اس مد میں خرچ ہوا کریں۔ تو اُن پر کس قاعدے سے واجب ہے کہ وہ اتنا بڑا بار اپنے اوپر اُٹھا دیں۔ البتہ خصوصیت کی جگہ ہر شخص انسانی اس قسم کے بار کو اعتدال کے ساتھ برداشت کرتا ہی ہے۔ بلکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر سوال کے ساتھ بطور فیس کچھ پیش کیا جاتا کہ اہل علم کی اعانت ہوتی خواہ ان کی ذات کی یا صرف آلات افتاء کی کیونکہ جواب کے لئے وقت بھی چاہیئے۔ کتب بھی چاہئیں۔ کبھی معین بھی درکار ہوتا ہے۔ خادم کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ڈاک لے جاوے وقت پہ لادے وعلیٰ ھذا۔ چنانچہ بعض اہل علم نے اسکا قاعدہ بھی مقرر کر دیا ہے جس میں کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہو۔ سو اگر کہیں ایسا نہ ہو اسی کو غنیمت سمجھیں کہ ہم پر بار نہیں پڑا نہ کہ اہل علم سے مالی بار اٹھوانے لگے

متوقع رہیں کہ ظلم عظیم ہے۔

پانچویں فصل اس میں بعض شبہات متفرقہ کا جواب ہے اور اس باب کی یہ اخیر فصل ہے۔ ایک شبہہ دنیاداروں کا اہل علم کی نسبت یہ ہے کہ ان میں باہم رد و قدح خوب ہوتا ہے۔ کبھی زبانی گفتگو میں اور کبھی رسالہ بازی کے ذریعے سے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں باہم عناد و حسد ہوتا ہے اور ہر شخص دوسرے کو گھٹانا اور مٹانا چاہتا ہے تو ایسے لوگوں سے اسلام کو بجائے نفع کے اور اُلٹا ضرر ہوتا ہے پس اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مولویت کا سلسلہ ہی موقوف کیا جائے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو خدا تعالیٰ نہ کرے سب اہل علم ایسے کیوں ہونے لگے۔ پھر ایک دو کو دیکھ کر سب پر ایک حکم لگا دینا انصاف اور حقیقت شناسی کے بالکل خلاف ہے۔ جن لوگوں میں یہ مرض ہے اُنکو خود محققین اہل علم بھی ناپسند کرتے ہیں۔ آپ ایسے حضرات سے استفادہ کیجئے جو ان امور سے منزہ ہیں۔ دوسرے ہر رد و قدح کو حسد اور عناد پہ محمول کرنا یہ بھی غلطی ہے۔ بعض دفعہ دونوں کی نیت بخیر ہوتی ہے مگر اختلاف تحقیق کے سبب ایک دوسرے کے قول کو رد کرتے ہیں۔ کیا وکلاء کا ہر مناظرہ نفسانیت پر محمول کیا جاوے گا یا حاکم بالا کا حاکم ماتحت کے فیصلہ کو منسوخ کر دینا اور اس کا رد لکھنا نفسانیت ہی پر ضرور محمول ہوگا بعض دفعہ ایک کی نیت درست ہوتی ہے کہ ایک باطل قول کو محض مسلمانوں کے بچانے کے لئے رد کر دیا یا اس کے قول حق کو کسی ایک صاحب باطل نے رد کیا تھا اُس نے اُس کا

جواب دیدیا اس میں شرعاً یا عقلاً کیا قباحت ہوگی۔ بلکہ بعض اوقات یہ واجب ہوگا۔ کیا اگر کوئی باغی جماعت پبلک میں باغیانہ خیالات پھیلاوے اور وائسرائے یا لفٹنٹ گورنر ایک عام جلسہ میں ان خیالات کو بدلائل رد کردے تو کیا اس کو سلطنت کی خیر خواہی نہ کہا جاوے گا۔ پھر کیا وجہ کہ ایسے رد کو اسلام کی خیر خواہی اور ضروری نہ کہا جاوے۔ تیسرے اگر بالفرض خدانہ کرے وہ سب علماء ایسے ہوتے تب بھی کیا یہ اثر علم دین کا ہوتا جس کو سبب نفرت عن العلوم بنایا جاوے یا یہ اثر علم دین میں سے ایک جزء پر عمل نہ کرنے کا ہوتا اور وہ جزء تربیت و اصلاح نفس ہے جس کی نہایت اہتمام سے تعلیم دی گئی ہے۔ پس اس سے تو علوم دینیہ کی اور بھی ضرورت ثابت ہوئی کہ اس سے تھوڑا سا بعد بھی کیسا مضر ہوا۔ پھر یہ کہ اگر کوئی عالم ایسا ہو بھی تب بھی وہ اپنے لئے ضرر رساں ہے یا دوسرے کم فہموں کے لئے کہ اس کی حقیقت نہ سمجھ کر مولویت کو مضر سمجھیں جن کو ابھی بیان کیا گیا ہے باقی فہیم تو سمجھ سکتا ہے کہ اس عالم کی مثال بدپرہیز طبیب کی سی ہے۔ کیا اس کی بدپرہیزی اُن نسخوں کو بھی غیر مفید کردے گی جو اُس نے اپنی حذاقت و مہارت فن سے کسی مریض کے لئے تجویز کئے ہیں۔ کیا اس حالت میں اُس سے نسخہ نہ پوچھا جاویگا۔ وہ اگر ماہر ہے تو نسخہ تو مفید ہی بتلاوے گا۔ اسی طرح اگر خدانخواستہ کوئی عالم حسد اور عناد کی بلاؤں میں مبتلا ہو مگر تم کو تو مسئلہ صحیح بتلاویگا۔ پھر تم اُس سے منتفع ہونے میں کیوں جھجک رہے ہو۔

ایک شبہہ یہ ہے کہ ان مولویوں میں اکثر مسئلوں میں باہم اختلاف ہوتا ہے جس سے عام لوگوں کو عمل کرنے میں سخت حیرت ہوتی ہے کہ کس پر عمل کریں کس کو ترک کریں۔ پس یہ مولویت کا سلسلہ بڑھانا اِس اختلاف کو اور زیادہ وسعت دیتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ کیا اطبا میں باہم تشخیص مرض و تجویز و تدبیر میں اختلاف نہیں ہوتا۔ کیا اس اختلاف سے بھی ایسی ہی تنگی ہوتی ہے اور کیا اس تنگی کے بعد کوئی شخص اپنے مریض کو بدون علاج ہی چھوڑ دیتا ہے کہ اختلاف کی حالت میں کس کا علاج کریں، تو لاؤ سب ہی کو چھوڑ دیں یا ایسا نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون طبیب زیادہ تجربہ کار اور ماہر فن ہے اور کس کے ہاتھ سے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہیں۔ اگر اختلاف اطبار سبب نہیں ہوتا تنگی و ترک معالجہ کا تو اختلاف علمار کیوں سبب ہوتا ہے تنگی اور ترک عمل کا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جس امر کو ضروری سمجھتا ہے اس میں ایسے خیالات سنگ راہ نہیں ہوتے اور جسکو ضروری نہیں سمجھتا اس کے ترک کے لئے ادنیٰ سا حیلہ گو بیہودہ ہی ہو کافی ہو جاتا ہے جس طرح وہاں ایک طبیب کو ایک خاص علامت سے جو اوپر مذکور ہوئی) ترجیح دے کر اُسکا علاج اختیار کیا جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی ایک عالم کو اُسی کی نظیر علامت سے (کہ کس عالم کو اہل فہم اور اہل دین علم اور عمل میں زیادہ سمجھتے ہیں اور کس کی تحقیقات نظر انصاف میں زیادہ اطمینان بخش ہوتی ہیں) ترجیح دیکر اس کے فتاوے کا اتباع کریں اسی اختلاف علمار کے متعلق ایک اور رائے بھی دی جایا کرتی ہے کہ علمار کے لئے باہم اختلاف رکھنا بہت مذموم ہے ان کو اتفاق

رکھنا چاہیئے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس کا لغو اور مہمل ہونا نہایت بین ہے۔ میں
پوچھتا ہوں کہ کیا ہر اختلاف ہر شخص کے لئے مذموم ہے۔ اگر یہ ہے تو چاہیئے کہ عدالت
میں جب کوئی مقدمہ پیش ہو جس میں ایک کا دعویٰ دوسرے کا جواب دعویٰ
داخل ہو تو عدالت بجائے اس کے کہ تنقیح و تحقیق کا بار اپنے ذمہ لے اول ہی
وہلہ میں محض اس بنا پر کہ یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں اور اختلاف مطلقاً
مذموم ہے فریقین کو ہمیشہ سزا کر دیا کریں کہ ایسے جرم اخلاقی کے کیوں مرتکب
ہوئے یا اگر اس جرم کو اس درجہ کا نہ سمجھے تو کم از کم ہر مقدمہ کو خارج
ہی کر دیا جاوے۔ کیا وجہ ہے کہ تحقیق واقعات کی کر کے ایک کو ڈگری دیتی
ہے۔ کیا وہ ایک مجرم اخلاقی کی طرفداری و حمایت کرتی ہے۔ اس سے
واضح معلوم ہوا کہ اہل اختلاف میں سے ہر ایک کو الزام دینا اور دونوں
کو مشورہ اتفاق دینا غلطی عظیم ہے۔ بلکہ اول تحقیق کر کے متعین کریں کہ
ان اہل اختلاف میں حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے۔ جو حق پر ہو اسکی طرف
ہو کر صاحب باطل کو مجبور کریں اور رائے دیں کہ تم کو اختلاف کرنا جائز نہیں
تم فلاں شخص کے ساتھ اتفاق کرو ورنہ قبل تعیین حق اگر وہ اتفاق بھی کرنا
چاہیں تو آخر اس اتفاق کا کوئی مرکز بھی تو ہونا چاہیئے اور وہ متعین نہیں
تو اتفاق کی کیا صورت ہوگی۔ اگر زید نے عمرو کو اپنے قول پر لانا چاہا اور عمرو
نے زید کو تو بھی اتفاق نہ ہوا اور زیادہ رنگ طبائع کا یہی ہے بھی۔ اور
یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اتفاق کے استحسان پہ اتفاق ہے پھر
اتفاق نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص دوسرے کو اپنے نقطۂ خیال پہ لانا چاہتا ہے۔

اسی طرح دوسرا بھی۔ اور اگر زید نے عمرو کا قول لے لیا اور عمرو نے زید کا قول لے لیا تو پھر باہم اختلاف رہا گو صورت دوسری ہو گئی اور اگر نہ یہ ہوا نہ وہ ہوا بلکہ اول مرجح کی تلاش ہوئی کہ اس کا اتباع دونوں کریں گے تو اُس کا حاصل وہی ہوا جو اوپر معروض ہوا ہے کہ اول تحقیق کر کے حق کو متعین کریں پھر صاحب باطل کو مجبور کیا جاوے کہ وہ حق کا اتباع کرے۔ صاحب حق کو کچھ رائے نہ دی جاوے۔ بہر حال نا اتفاقی کا الزام جانبین کو دینا یہ ایک بے تحقیق اور غلط فیصلہ ہے۔

ایک اعتراض عموماً علماء کی نسبت یہ کہ علماء اپنے فتاوی میں مصلحت زمانہ کا خیال نہیں کرتے وہی پُرانے مسائل بتلا دیتے ہیں حالانکہ زمانہ کی ضرورتیں بدل گئی ہیں اور زمانہ کی ضرورت سے احکام بدل جاتے ہیں اب علماء کو چاہیئے کہ سود کو اور معاملات ربویہ وفاسدہ کو درست کہدیں۔

یہ اعتراض اسقدر ظاہر البطلان ہے کہ اس میں ردھی کی احتیاج نہیں۔ یہ تو جب کہا جاتا کہ شریعت کے احکام کسی بشر کے بنائے ہوئے ہوتے تو اس احتمال کی گنجائش تھی کہ اُس بشر کو آئندہ مصالح پر نظر نہ تھی۔ جب مصالح بدل گئے تو احکام کا بدل ڈالنا بھی مناسب ہے اور جس حالت میں وہ احکام خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں خواہ بواسطہ وحی متلو یا وحی غیر متلو یا اگر وہ اجتہادی ہوں تو بوجہ عزت علم و تدین و تورع اُن مجتہدین کے اُن میں استنادالی الوحی کا ظن زیادہ غالب ہے بہ نسبت ہمارے استنباط کے تو وہ احکام بھی بوجہ اس کے کہ قیاس مظہر ہوتا ہے مثبت نہیں ہوتا نیز ثابت بالوحی ہوئے۔ بہر حال جب یہ

سب احکام شرعیہ خدا تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں جن سے قیامت تک کی مصالح کی ایک جزئی مخفی نہیں۔ تو ان میں یہ احتمال کب ہے کہ آئندہ کی مصالح کی رعایت نہیں کی گئی بلکہ جس مصلحت کی اُس میں رعایت نہیں وہ واقع میں مصلحت ہی نہیں۔ اور مصالح کے تبدل سے احکام کا بدلنا وہاں ہے جب اس مبنی اس حکم کا کوئی خاص مصلحت یقیناً ہو اور جہاں خود اسی کا تیقن نہ ہو تو مصالح تخمینیہ ظنیہ پر مدار حکم نہیں ہے۔ جیسے حطیم کو کعبہ کے اندر شامل نہ کرنا مبنی تھا مصلحت دفع تشویش عوام پر جب عبد اللہ بن زبیر نے اس مصلحت کا ارتفاع دیکھ لیا اور اندیشہ تشویش کا نہ رہا حطیم کو داخل کر دیا۔ گو بعد میں ان کے مخالفین نے پھر خارج کر دیا بخلاف رمل فی الطواف کے کہ ظاہراً مصلحت اسمیں ارأہ قوت تھی مشرکین کو اور وہ اب نہیں ہے تو چاہیئے تھا کہ وہ حکم مرتفع ہو جاتا مگر بعد فتح مکہ کے حجۃ الوداع میں بھی رمل کا ہونا یہ دلیل اس کی ہے کہ وہ ایک وقتی مصلحت تھی لیکن اصل میں مبنی حکم کا وہ نہ تھا اسلیئے وہ حکم مرتفع نہیں ہوا سو منصوصات میں تو کسی علت نکالنے کی حاجت ہی نہیں۔ البتہ اجتہادیات میں علت نکالی جاتی ہے مگر ہم کو علت نکالنے کی لیاقت نہیں ہے۔ جو اسکے اہل تھے وہ گذر گئے۔ کیا پارلیمنٹ دہلسہ وضع قوانین کا ممبر ہر قانون داں یا ہر دانا ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوانین کے اسرار کا جاننا خاص ہی لوگوں کا کام ہے نہیں ہر ایک کو اسکا دعویٰ زیبا نہیں اسلیئے یہ اعتراض بھی لغو ثابت ہوا۔

ایک اعتراض مولویوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ مخدوم بنے گھروں اور مدرسوں اور مسجدوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور قوم کی تباہی پر ان کو رحم نہیں آتا اور گھر سے

نکلکر گمراہوں کی دستگیری نہیں کرتے۔ لوگ بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی اسلام کو چھوڑ رہا ہے۔ کوئی احکام سے محض بے خبر ہے لیکن ان کو کچھ پروا نہیں۔ حتیٰ کہ بعضے تو بلانے سے بھی نہیں آتے۔ اور آرام میں خلل نہیں ڈالتے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اعتراض اس وقت کسی درجہ میں لوگوں کے حق میں صحیح ہو سکتا تھا کہ تبلیغ اسلام و احکام اب بھی فرض ہوتی تب بیشک ضروری تھا کہ گھر گھر شہر شہر سفر کر کے جاتے یا کسی کو بھیجتے اور لوگوں کو احکام سناتے۔ لیکن اب تو اسلام و احکام شرقاً غرباً مشتہر ہو چکے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں جس کے کانوں میں اصولاً و فروعاً اسلام نہ پہونچ چکا ہو اور جو لوگ کسیقدر لکھے پڑھے ہیں اُن کو تو بذریعہ رسائل مختلف مذاہب تک کا بھی علم ہے اور اگر کسی مقام پر فرضاً کوئی احکام کا بتلانے والا نہ بھی پہونچا ہو تاہم اُس مقام کے لوگ (اگر کل نہیں تو بعض ہی) دوسرے مقامات پر پہنچے ہیں اور احکام سنے ہیں (اور ان بعض سے دوسرے بعض کو پہنچے ہیں) بہرحال جن مقامات کا ہم کو علم ہے اُن میں سے کوئی مقام ایسا نہیں جہاں اسلام و احکام نہ پہونچے ہوں۔ اور فقہاء نے کتاب السیر میں تصریح فرما دی ہے اور عقل میں بھی یہ بات آتی ہے کہ جہاں اسلام و احکام پہونچ گئے ہوں وہاں تبلیغ واجب نہیں۔ البتہ مندوب ہے۔ پس جب تبلیغ واجب نہیں تو اُس کے ترک پر ملامت کیسی۔ اور اگر ترک مستحب پر یہ الزام ہے سو اول تو وہ محل الزام نہیں۔ دوسرے اس سے قطع نظر اگر ان لوگوں کو کوئی شغل ضروری نہ ہو تو کچھ گنجائش بھی ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام کی دوسری خدمت کر رہے ہیں وہ بھی جب ضروری کاموں میں لگ رہے ہیں تو پھر گنجائش اس شبہہ کی کہاں ہے

دوسرے جس طرح علماء کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان گمراہوں کے گھر پہونچ کر ہدایت واصلاح کریں۔ خود ان گمراہوں کو یہ رائے کیوں نہیں دی جاتی کہ فلاں جگہ علماء موجود ہیں تم ان سے اپنی اصلاح کرلو۔ تیسرے کیا اسلام کی یہ خدمت صرف علماء ہی کے ذمہ ہے۔ دوسرے دنیادار مالدار مسلمانوں کے ذمہ نہیں یعنی اُن کو بھی چاہیئے کہ سمجھیں کہ علماء کو معاش سے فراغ نہیں۔ آپس میں کافی سرمایہ یعنی روپیہ جمع کرکے علماء کی ایک جماعت کو خاص اسی کام کے لئے مقرر کریں اور اُن کی کافی خدمت مالی کرکے معاش سے اُنکو مستغنی کریں۔ پھر وہ علماء معاش سے بے فکر ہوکر اس خدمت کو انجام دیں۔ جس طرح مشنری لوگ بڑے بڑے مشاہرے پارہے ہیں اور جابجا لکچر دیتے اور رسائل تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔ اور ہمارے حضرات معترضین کو جو یہ اعتراض مذکور علماء پر سوجھا ہے وہ انہیں مشنریوں کی مساعی کو دیکھ کر سوجھا ہے۔ اور یہ اس وقت کچھ عام عادت ہوگئی ہے کہ اصل حقیقت میں غور نہیں کرتے۔ بس دوسری قوموں کے رسم ورواج کو اپنا رہنما بناکر اُن کی موافقت ومخالفت کو معیار استحسان وعدم استحسان کا قرار دیا ہے۔ چونکہ مشنری لوگ ایسا کررہے ہیں اور علماء کو ایسا کرتے کم دیکھا ہے بس اعتراض کردیا۔ لیکن قطع نظر حقیقت بینی کے جس کے متعلق بندہ نے اوپر عرض کیا ہے یہ بھی نہ دیکھا کہ اپنے علماء پر اُن کے علماء کے برابر سعی نہ کرنے کا الزام دینے سے پہلے ہم یہ بھی تو دیکھ لیں کہ آیا ہمارے دُنیادار اُن کے دنیاداروں کے برابر بھی اعانت مالی کرتے ہیں یا نہیں۔ یہاں وہی مثل صادق ہے۔ مصرع

حفاظت شیٔ و غایت علت اشیاء

البتہ اگر کوئی مقام ایسا ثابت ہو جائے تو بیشک وہاں تبلیغ اسلام کے وجوب کا انکار نہیں۔ لیکن یہ وجوب علماء کے ساتھ خاص نہیں سب اہل اسلام پر بقدر اپنی اپنی وسع کے واجب ہوگا۔ ایک شبہہ طالب علموں پر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تقریر و تحریر میں قاصر ہوتے ہیں۔ لیکن اس شبہہ میں نہایت بے انصافی سے کام لیا گیا ہے۔ ایک دو کو دیکھ کر سب پر ایک حکم لگا دیا گیا ہے۔ کیا علماء و طلباء میں بیحد خوش تحریر و خوش تقریر بکثرت نہیں پائے جاتے۔ کیا ان خوش بیانوں کا مقابلہ دوسری تعلیم کا کوئی بڑے سے بڑا فاضل کر سکتا ہے۔

پس جن طلباء میں اس کی کمی ہے اس کی ذمہ دار خود ان کی کم ہمتی و بے توجہی ہے۔ البتہ اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مثل دیگر علوم کی تعلیم کے خوش تحریری و خوش تقریری کی مشق کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جاوے۔ اس طور پر کہ وہ طلباء کا اختیاری امر نہ رہے بلکہ سب کو اس پر مجبور ہونا پڑے مگر پھر بھی ایسے لوگ (گو قلیل ہی سہی) ثابت ہوں گے کہ ان کو فطری طور پر تقریر و تحریر سے مناسبت کم ہوگی سو ایسے لوگ اپنے عمل کے لئے علم پڑھیں دوسروں کے افادہ کے لئے۔ اور بہت لوگ مل سکیں گے۔ یہ کیا فرض ہے کہ ہر کام ہر شخص کیا کرے۔ اس کے متعلق ایک شبہہ خط کے خام ہونے کا ہے سو میرے نزدیک یہ امر کوئی قابل التفات نہیں۔ خط کا صاف ہونا تو ضروری امر ہے کہ بے تکلف پڑھا جاوے۔ کیونکہ بدون اس کے جو مقصود ہے کتابت سے وہی فوت ہوتا ہے۔ باقی باقاعدہ اور

خوشنما ہونا یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ اس کو ضروری سمجھنا یہ ایک عامی خیال ہے۔

ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ طالب علموں کو عقل کم ہوتی ہے۔ معاملات کو نہیں سمجھتے۔ اکثر دنیا کے قصوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا جاوے جس کا تعلق کسی معاملہ سے ہو تو اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اگر کوئی انتظامی کام ان کے سپرد کیا جاوے تو اس کو کر نہیں سکتے۔ اس شبہ میں بھی نہایت ہی عدم تدبر سے کام لیا گیا ہے۔ اس معترض نے عقل اور تجربہ کو ایک قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ کیا اگر کسی بڑے عاقل فاضل شخص کو یہ نہ معلوم ہو کہ فلاں کارخانے میں فلاں نمبر کا جوتہ کس قیمت کا ہے تو کیا اس کو اتنی بات پر بیوقوف کہہ دیں گے۔ اگر کوئی ایسا کہے گا تو وہ خود اس لقب کے قابل ہو گا۔ اسی طرح اہل علم کو جن معاملات سے سابقہ کم پڑتا ہے یا نہیں پڑتا اُن کے متعلق اُنکی معلومات کم ہوتی ہیں یا نہیں ہوتیں۔ اور ایسے ہی اُمور کی نسبت جب اُن سے ناتمام عبارت میں سوال کیا جاتا ہے تو اُن کو اُس سوال کے اجزار کے سمجھنے کی ضرورت ہونا پھر محل تعجب یا اعتراض کیا ہے۔ کمی تو سائل کی ہے کہ اُس کو اظہار واقعہ کا سلیقہ نہیں اور ایسے افہام وتفہیم کی احتیاج تو ہائیکورٹ کے ججوں تک کو ہوتی ہے جو کہ اکمل علمار قانون وافضل عقلار ملک تسلیم کرلئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہم شب نہ روز دیکھتے ہیں کہ انگریزی خواں بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرکے سارٹیفکٹ لے کر آتے ہیں اور ادنی سا کام سب انسپکٹری یا نائب تحصیلداری کا بھی بدون

سکھلائے نہیں کر سکتے۔ تعجب ہے کہ دونوں طرف ایک ہی حالت پھر اس حالت کا نام ایک طرف ناتجربہ کاری اور دوسری طرف بے عقلی رکھا جاوے کیا یہ ظلم نہیں ہے۔ اگر اہل علم کسی طرف ادنیٰ توجہ کرتے ہیں تو وہ اِن دنیا کے کاموں کو بھی ایسا اچھا کرتے ہیں کہ بڑے بڑے تجربہ کار دنگ رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے زندہ نظائر بکثرت موجود ہیں۔

الباب الثانی

حقوق العلم علی العلماء الاعلام والطلبۃ الکرام

فصل پہلی

بعض طلبہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ابھی تو ہمارا زمانہ تحصیل علم کا ہے۔ اس زمانہ میں عمل کی چنداں ضرورت نہیں بعد فراغ عمل بھی کر لیں گے اور یہ سراسر شیطانی دھوکہ ہے۔ نصوص نے طلبہ اور علماء میں وجوب احکام میں کہیں فرق نہیں کیا۔ پھر اس خیال کی گنجائش کب ہو سکتی ہے۔ البتہ اعمال زائدہ جن میں زیادہ قوت صرف ہو وہ بیشک طلبہ کے لئے مناسب نہیں جیسے اوراد طویلہ و مجاہدات و ریاضیات اہل تصوف کے۔ ان میں مشغول ہونے سے مطالعہ درس و تکرار سبق میں مشغول ہونا طالب علم کے لئے افضل ہے۔ بعض بلیاک طلبہ میں ایک قول مشہور ہے یجوز لطالب العلم مالا یجوز لغیرہ۔ اگر یہ اپنے عموم ظاہری پر رکھا جاوے تب تو اس کے جواب میں ھاتوا برھانکم اِن کنتم صادقین

پڑھ دینا کافی ہے اور اگر عموم پر نہ رکھا جائے تو مطلق انعنانی و بدعملی کے جواز کے لئے سفینہ نہیں۔ اگر یہ کسی معتبر قائل کا قول ہے تو معنے یہ ہیں کہ بعض امور جو غیر اہل حاجت کے لئے درست نہیں جیسے صدقہ و خیرات کا لے لینا یا کوئی چیز کسی سے ضرورت کے وقت مانگ لینا وہ طالب علم کے لئے بوجہ حاجتمند ہونے کے مباح ہے تو مدار اس حکم کا خاص وصف طالب علمی نہیں بلکہ احتیاج ہے۔ چونکہ طالب علم بھی اکثر صاحب احتیاج ہوتا ہے اس لئے یہ بھی ایک عنوان احتیاج کا ہوا۔ پس غیر سے مراد اس بنا پر غیر محتاج ہوگا نہ مطلق غیر طالب علم۔ اور رہا اپنے عموم پر نہ ہوگا بلکہ بدلائل شرعیہ خصوص میں مستعمل ہوگا۔

دوسری فصل:۔ بعض منسوبین الی العلم علوم دینیہ کو ذریعہ اپنے اغراض فاسدہ دنیویہ لغسانیہ کا بنا لیتے ہیں۔ جس سے وہ خود تو بدنام اور بے وقعت ہوتے ہیں مگر اپنے ساتھ تمام جماعت اہل علم کو بدنام اور بے اعتبار ٹھیراتے ہیں ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

اگرچہ یہ معترضین کی بے انصافی و کوتہ نظری ہے کہ ایک پر سب کو قیاس کر کے سب پر ایک حکم لگا دیتے ہیں۔ کیا اگر کوئی اناڑی عطائی خلاف اصول طب کسی کا علاج کرے یا کسی کو دھوکا دے کر کچھ ٹھگ لے تو کیا ملک کے تمام ماہرین و مبصر حکیم اطباء کے کمال علمی و عملی کی نفی جائز ہوگی ہرگز نہیں

لیکن عوام سے اس غلطی کا صدور زیادہ عجیب نہیں۔ جبکہ منسوبین الی العلم سے اس سے بڑی غلطی یعنی علم دین کو آلہ دنیا بنانے کا صدور ہو رہا ہو۔ کیونکہ علم ایک بہت بڑا سبب حامل علی العمل ہے۔ جب کثیر العلم اتنی بڑی غلطی کرے تو قلیل العلم سے زیادہ بعید نہیں۔ گو مطلق علم پر نظر کرتے ہوئے ایک درجہ میں بعید ضرور ہے اور وہ اغراض باوجود تعدد و تکثیر کے دو کلیوں میں داخل ہیں۔ ایک طلب مال دوسرے طلب جاہ۔ طلب مال کی چند صورتیں ہیں۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ وعظ کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور ہر جگہ خاص اس غرض سے وعظ کہتے پھرتے ہیں کہ کچھ مال وصول ہو۔ پھر بعضے تو حیا و شرم کو بالکل بالائے طاق رکھ کر صریح سوال کرتے ہیں اور ان وعیدوں کو جان کر بھلا دیتے ہیں جو بلا اضطرار مانگنے کے باب میں وارد ہیں۔ مثلاً ترمذی میں ہے — عن حبشی بن جنادة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المسئلة لاتحل لغنی ولا لذی مرة سوی الا لذی فقر مدقع او غرم مفظع وسأل الناس لیثری به ماله کان خموشا فی وجهه یوم القیامة ورضفا یاکله من جهنم فمن شاء فلیقل ومن شاء فلیکثر۔ بالخصوص علم دین کو آلہ اور ذریعہ بنانا موجب زیادہ وعید کا ہے۔ چنانچہ احمدؒ اور ابوداؤدؒ اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تعلم علما مما یبتغی به وجه اللہ لا یتعلمه الا لیصیب به عرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنة یوم القیامة یعنی ریحها اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ عن بریدة قال

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قرأ القرآن یتاکل بہ الناس جاء یوم القیامۃ ووجھہ عظم لیس علیہ لحم اور ظاہر ہے کہ کوئی اضطرار ان کو نہیں ہے۔ دوسرے وجوہ حلال معاش کے موجود ہیں جن میں ایک وجہ حلال وہ بھی ہے جس کا قاعدہ باب اول کی دوسری فصل تحت آیت للفقراء الذین احصروا الآیۃ۔ میں مفصل مذکور ہوا ہے جس سے وعظ کی نوکری کا بطور مشاہرہ کے جائز ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر محض اشاعت احکام حسبۃ للہ کرے اور لوگ متفرق طور پر کچھ خدمت کر دیں اور قلب میں کچھ طمع نہ ہو گو احتمال و وسوسہ ہو وہ بھی جائز ہے۔ یہ دونوں صورتیں اسی قاعدہ مذکورہ باب اول فصل ثانی میں داخل ہیں اور امتحان اس کا کہ یہ کام حسبۃ للہ کیا جاتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے وہ بطور جزائے حبس کے ہے۔ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وعظ کہنے کے واسطے جانے کے لئے یہ شخص کن مقامات کو منتخب کرتا ہے۔ آیا ان مقامات کو جہاں روپیہ ملنے کی زیادہ امید ہو یا ان مقامات کو جہاں تبلیغ احکام کی زیادہ ضرورت ہو۔ صورت اول میں یہ شخص اس قاعدہ جواز کا مورد نہ ہوگا۔ دوسری صورت میں ہوگا اور یہی امتحان ہے۔ تدریس علوم دینیہ کی نوکری کرنے والے کا اس شخص کو کام مقصود ہے یا مال مقصود ہے۔ اگر اس کی نظر تنخواہ پر ہوگی تو اگر ایک جگہ گذر ہوتا ہو اور وہاں علوم دینیہ کی ضرورت بھی زیادہ ہو تو ایسی جگہ کو چھوڑ کر ترقی پر نہ جاوے گا ورنہ خود کوشش کر کے ایسی جگہ جانا چاہیگا اور فقہا نے جو تعلیم علوم دینیہ یا وعظ پر اُجرت کی اجازت دی ہے۔ مراد اس سے یہی صورت ہے ورنہ اُجرت علی الطاعات المقصودۃ المخصوصۃ بالاسلام کو حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ بوجہ نہی کے کسی طرح جائز نہیں رکھتے اور غالب یہ ہے (اور اگر کسی محقق شافعی سے تحقیق

کیا جائے تو کیا عجب یہ ظن صحیح نکلے، کہ شافعیہ جو بعض طاعات کی اُجرت کو جائز رکھتے ہیں جیسے تعلیم قرآن و علوم دین وہ مقید ہوگا اُس صورت کے ساتھ جبکہ ثواب مقصود نہ ہو اور اس صورت میں وہ بھی اس نہی کے مخالف نہ ہوں گے جس سے حنفیہ نے تمسک کیا ہے جس میں قوس کے ہدیہ لینے کی نسبت سوال کیا گیا ہے کہ وہاں قرآن مجید ثواب کے لئے پڑھایا تھا اور اس تقریر پر فقہا حنفیہ متقدمین و متاخرین میں اُجرت علی التعلیم کے جواز و عدم جواز میں اختلاف لفظی ہے ورنہ حقیقۃً اجارہ کے ناجائز اور صورت اجارہ کے جائز ہونے میں اختلاف کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی ۔ اور جواز میں جو یہ قید لگائی ہے کہ قلب میں کچھ طمع نہ ہو اُس کی دلیل یہ حدیث ہے جسکو شیخین نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اُن سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فما جاءک من ھذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہ ومالا فلا تتبعہ نفسک ۔

اور احتمال و وسوسہ اور طمع و اشراف میں فرق یہ ہے کہ اگر خیال ہوا کہ شاید کچھ ملے نہ ملنے سے اذیت نہ ہوئی تو صرف وسوسہ تھا اور اگر ایذا اور رنج ہوا اور قلب میں شکایت اور ناگواری ہوئی کہ ان لوگوں نے کچھ نہیں دیا تو طمع اور اشراف تھا یہ تو وعظ کے ذریعے سے کمانے والوں کا بیان تھا جس کے متعلق یہ بھی ایک تجربہ اور استقراء ہے کہ اکثر ایسے لوگ باقاعدہ عالم اور ذی استعداد بھی نہیں ہوتے ۔ ورنہ کمال علمی کے لئے غیرت اور حمیت خاص لازم ہے۔ اُس سے ایسی بے حمیتی کا کام نہیں ہو سکتا اور بعضے صریح سوال نہیں کرتے مگر ان کے طرز و انداز سے اُن کا سائل ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ ان کا حکم بھی مثل صریح سائلوں کے ہے۔ گو وجہ دلالت دونوں جگہ مختلف ہو مگر مدلول تو واحد و مشترک ہے اور بعضے بذریعہ وعظ یا بلا وعظ

محض ملاقات و خاص خطاب سے خود اپنی حاجت کے لئے سوال نہیں کرتے مگر کسی مدرسہ یا انجمن کے لئے چندہ طلب کرتے ہیں اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ واقع میں وہ مدرسہ یا انجمن نافع اور ضرورت پر مبنی ہے اور یہ شخص محض دینی منفعت اہل اسلام کو پہنچانے کے لئے بلا جبر و بلا کسی خداع و تلبیس کے اُس میں شریک ہونے کی ترغیب دیتا ہے پھر خواہ اسکو قاعدہ مذکورہ باب اول فصل ثانی کے طور پر اسکی تنخواہ بھی اُس مدرسہ یا انجمن سے ملتی ہے یہ صورت تو ہماری اس فہرست طرق مذمومہ طلب مال سے خارج و مستثنیٰ اور عموم مفہوم آیۃ ھاانتم ھؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ الخ میں داخل ہے جیسا باب اول فصل ثانی کے اخیر میں مذکور ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ نہ اُس انجمن یا مدرسہ کا انعقاد یا افتتاح اس غرض سے ہوا ہے کہ اپنا گذر ہو اپنی بسر کی ایک صورت نکلے اور اُس کا نہ ہونا کچھ مضر نہیں یا یہ کہ وہ ضروری ہو مگر اس شخص کی نیت خاص اپنا دُنیوی نفع ہو تو گو اُس انجمن کی خدمت والقاء کو ضروری کہا جاوے گا مگر اُس شخص کے لئے یہ شیوہ حلال نہ ہو گا مطلقاً اور خصوص جبکہ طلب چندہ میں شرمانے سے دباؤ ڈالنے سے بھی کام لیتا ہو اُس وقت مضاعف گناہ ہو گا بدلیل حدیث بیہقیؒ و دارقطنیؒ کے قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ۔ بعض کو اس میں یہ غلطی ہوتی ہے کہ کہتے ہیں کہ ہماری کیا وجاہت اور دباؤ ہے تو جو شخص دیگا خوشی ہی سے دیگا حالانکہ مشاہدہ اسکی تکذیب کرتا ہے اس کا حال دینے والے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جب وہ ان بزرگ کے کہنے کے بعد کچھ دے پیچھے کوئی تیسرا آدمی جو اس سے بے تکلف ہو اُس سے قسم دیکر پوچھے کہ تو نے خوشی سے دیا ہے یا ناخوشی

سے بہت آسانی سے اُسکا فیصلہ ہو جائے گا۔ اسی سے حکم معلوم ہو جائے گا۔ یا اُن رقوم کا جو لڑکی والے یا مساجد و مدارس والے شادی کے مواقع پر لڑکے والے سے فرمائش کر کے لیتے ہیں وہ لوگ خواہ رسم کی پابندی سے یا مجمع کی شرم سے یا محرک کے لحاظ سے دیتے ہیں بعض اوقات بلا تحریک بھی دیدیتے ہیں۔ لیکن دینے کی بنا وہی رسم ہے کہ جانتے ہیں کہ نہ دینے سے یا مانگا جاویگا یا بدنام کیا جاوے گا سو اس قسم کی رقمیں شرعاً حلال نہیں ہوتیں اور اس طرح سے مانگنا یا لینا درست نہیں ہوتا اور یہ رقوم سب واجب الرد ہیں۔ اگر رد کیجاویں تو مالک رقوم کو واپس کیجاویں خواہ وصول کسی کے ہاتھ سے ہوا ہو کیونکہ یہ ذی الید نائب اُس مالک کے ہیں تو اُن کا ہاتھ اُسی کا ہاتھ ہے۔ اور بعض کو یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لئے تو نہیں مانگتے اللہ کے کام کے واسطے مانگتے ہیں لیکن یہ عذر محض باطل ہے۔ اس لئے کہ معصیت ہر حال میں معصیت ہے۔ دین کے واسطے بھی معصیت حلال نہیں ہو جاتی ہے بلکہ غور کیا جاوے تو اس کا قبح عقلاً و نقلاً زیادہ اشد ہے۔ نقلاً تو اس لئے کہ یہ شخص معصیت کو ذریعہ ثواب کا بنا رہا ہے تو حرام کو آلہ دین کا بنانا اور اسمیں اعتقاد ثواب اور تقرب کا رکھنا یہ اشد معصیت ہے۔ فقہاء نے تو حرام میں ثواب کی توقع کو کفر تک کہدیا ہے۔ اور عقلاً اس لئے کہ ہر فعل اپنی غایت کے لئے مقصود ہوتا ہے اور غایت دین کے کام کی رضائے حق ہے۔ جب اُس کو خلاف شرع طریقہ سے کیا تو رضائے حق بھی نصیب نہ ہوئی تو خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق ہو اور اگر اپنے نفس کیلئے گناہ کیا جاتا تو اسکی جو غایت تھی حظ نفس وہ تو حاصل ہوتا۔ پس دین کے لئے گناہ کا کام کرنا عقلاً بھی زیادہ بُرا ہوا دنیا کے لئے گناہ

کا کام کرتے سے۔ اور گو یہ بلا یعنی یہ فعل محض منسوبین الی العلم کا مخصوص انکے ساتھ نہیں بلکہ بعض اہل وجاہت طبقۂ معززین دنیا کے بھی اس میں مبتلاء اور شریک ہیں۔ چنانچہ قومی انجمنیں اور قومی اسکول و کالج دنیوی تعلیم کے زیادہ انہی صاحبوں کے ہاتھ میں ہیں اور یہ حضرات بھی چندوں کے لئے بڑی بڑی تحریکیں کرتے اور خاص اثروں سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کے سامنے تو ان بعض اہل علم کی کارروائی کسی شمار ہی میں نہیں کئی وجہ سے اول تو اہل علم میں بہت شاذ و نادر اس کام کو کرتے ہیں اور اہل وجاہت میں شاذ و نادر اس کام کو نہ کرتے ہونگے دوسرے اہل علم بہت تھوڑی رقم پر قناعت کرتے ہیں اور اہل وجاہت بڑی بڑی رقموں کو بھی کم سمجھتے ہیں۔

تیسرے اہل علم اکثر خطاب عام کرتے ہیں اور یہ حضرات خطاب خاص سے بھی کہیں نہیں رکتے۔ چوتھے اہل علم کا اتنا دباؤ نہیں پڑتا اور ان صاحبوں کا بہت دباؤ پڑتا ہے خود وجاہت کا بھی اور بعض جگہ حکومت کا بھی۔ اور بعض جگہ اس اندیشہ کا بھی کہ ان کا کہنا نہ ماننے سے شاید یہ ہم کو کوئی مضرت پہونچا دیں۔ پانچویں اہل علم جب اس کو دین کے کام میں خرچ کرتے ہیں تو دینے والا اس قصہ کو دیکھکر اکثر اپنی ناگواری کو مبدل بخوشی کرلیتا ہے جس سے وہ وبال استحصال بالکراہت کا خفیف ہوجاتا ہے۔ اور یہ حضرات جہاں اس کو خرچ کرتے ہیں ظاہر ہے کہ دین تو ہے نہیں کہیں مباح ہوتا ہے اور اکثر معصیت۔ تو دینے والے کا افسوس کبھی دور نہیں ہوتا۔ اور اس وجہ سے اس خاص طرز سے استحصال کا وبال ہمیشہ گلوگیر رہتا ہے۔ غرض یہ بلا یہ ان اہل وجاہت میں بھی مع زیادہ بل زیادات پائی جاتی ہے۔

اور اس وجہ سے ان حضرات کو اہل علم پر اس خاص عمل کے متعلق کوئی اعتراض یا نکیر کرنے کا بالکل حق حاصل نہیں لیکن کسی بلا کے عام اور مشترک ہونے سے اُنمیں جواز نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس لیے اہل علم کو اس کے ارتکاب کی یا اس میں اہل دُنیا کی تقلید کی ہرگز گنجائش نہیں۔ اہل دنیا جو چاہیں کریں۔ اہل علم کو اپنے علم کے مقتضا کے خلاف ہرگز کرنا نہ چاہیئے۔ اوّل تو فی نفسہ عند اللہ بھی بُرا ہے اور جان کر اور زیادہ بُرا ہے ؎

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

پھر اس کا اثر دوسروں پر بھی بُرا پڑتا ہے۔ چنانچہ عام لوگ اکثر مواقع پر یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ میاں جب مولوی ایسا کرتے ہیں تو ہم کیوں نہ کریں تو اس طور پر ایسے اعمال ضلال کے ساتھ اضلال کی بھی شان رکھتے ہیں اور ضلال و اضلال کی وعیدیں مخفی نہیں۔ صرف تین حدیثیں لکھے دیتا ہوں۔ ایک ضلال کی ایک اضلال کی ایک مشترک۔

شیخین رح نے روایت کیا ہے۔ عن اسامۃ بن زید رض قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یجاء بالرجل یوم القیمۃ فیلقی فی النار فتندلق اقتابہ فے النار فیطحن فیہا کطحن الحمار برحاہ فیجتمع اھل النار علیہ فیقولون ای فلان ما شانک الیس کنت تامرنا بالمعروف وتنھانا عن المنکر قال کنت اٰمرکم بالمعروف ولا اٰتیہ وانھاکم عن المنکر واٰتیہ اور حدیث ہے قال رسول

اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من سن سنۃ سیئۃ فلہ وزرہا وزر من عمل بہا من غیر ان ینقص من اوزارہم شیٔ

اور دارمی میں ہے قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم الا ان شر الشر شرار العلماء وان خیر الخیر خیار العلماء۔

اس لئے علماء پر ضرور ہے کہ ایسے اعمال جو خلاف شرع و خلاف وضع ہوں ہرگز اختیار نہ کریں۔ توکل پر دین کی خدمت کریں۔ خطاب عام سے ترغیب الی الخیر والانفاق فی سبیل اللہ حسب موقع کر دینا مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی راغب الی الخیر میسر ہو جائے جو مصارف خیر کا جویاں رہتا ہے اور پورا یقین ہو کہ خطاب خاص سے اس کی آزادی میں ذرا اختلال نہ ہوگا اور جو کچھ کریگا بطیب خاطر کریگا تو ان قیود کے ساتھ خطاب خاص کا مضائقہ نہیں۔ باقی ناجائز یا رکیک افعال عوام کے لئے علم دین سے موجب تحقیر اہل علم ....

... ہو جاتے ہیں جس کے انسداد کے زیادہ ذمہ دار اہل علم ہیں۔ یہ کلام مختصا متعلق چندہ طلب کرنے کے۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ امراء و اہل اموال سے اختلاط وارتباط اس غرض سے رکھتے ہیں کہ ان سے وقتاً فوقتاً کچھ حاصل ہوتا ہے اور اس غرض کے لئے کاہے یہاں تک نوبت آتی ہے کہ ان کے غرض کے موافق مسئلہ بنا دیتے ہیں بلکہ بنا لیتے ہیں۔ جس سے سردست تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور ان کی خوشی سے ان کا کچھ کام نکل جاتا ہے۔ لیکن بہت جلدی ہی یہ ان کی نظر سے گر جاتے ہیں اور پھر وہ ان پر دوسرے علماء کو قیاس کر کے جماعت کی جماعت سے بدظن اور علم دین سے نفور ہو جاتے ہیں۔ تو اس طور پہ یہ لوگ مناع للخیر اور لیصدن

عن سبیل اللہ کے مصداق بنتے ہیں ۔ اس کی مذمت احادیث میں بھی وارد ہے۔ ابن ماجہ سے حدیثیں نقل کرتا ہوں ۔ عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان اناسا من امتی سیتفقہون فی الدین ویقرؤن القرآن ویقولون نأتی الامراء فنصیب من دنیاھم ونعتزلھم بدیننا ولا یکون ذلک کما لا یجتنی من القتاد الا الشوک کذلک لا یجتنی من قربھم الا قال محمد بن الصباح کانا یعنی الخطایا وعن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ قال لو ان اھل العلم صانوا العلم ووضعوہ عند اھلہ لسادوا بہ اھل زمانھم ولکنھم بذلوہ لاھل الدنیا لینالوا بہ من دنیاھم فھانوا علیھم الحدیث ۔ اور اختلاط میں جو اس غرض کی قید لگائی کہ ان سے کچھ حاصل ہوتا رہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر اختلاط اس غرض سے ہو کہ ان کی اصلاح ہو ان کو احکام دینیہ بتلائے جاویں خصوص جب کہ وہ خود خواہش کریں ۔ اور ان کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو تو یہ بلانا قرینہ دین کا ہے ایسا اختلاط مضر دین ہے ۔ نہ موجب ذلت ہے مگر جب کہ یہ قرائن سے یا شرط سے معلوم ہو کہ میں آزادی کے ساتھ حق ظاہر کرسکوں گا ورنہ اگر یہ معلوم ہو کہ ان کے بلانے کی غرض اپنے کسی خاص خیال کی تائید کرانا ہے تو اس جگہ جانا اوپر کی وعیدوں کا مصداق بنتا ہے اور ایسی حالت میں اگر وہ کچھ خدمت کریں لینے کا مضائقہ نہیں ۔ مگر مشورہ احقر کا یہ ہے کہ ہرگز قبول نہ کرے بلکہ جانے سے قبل شرط کرلے کہ دینے لینے کا کچھ قصہ نہ ہو اسکا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے جس کا حاصل

یہ ہے کہ اس صورت میں اُن امراء کا حوصلہ نہیں پڑتا کہ اہل علم کو اپنا تابع نہ بنانیکا
وسوسہ بھی لاویں بلکہ ہر طرح اُن کو اُن کے تابع ہونا پڑتا ہے اور یہی امر
مہتم بالشان ہے اور اگر خود امراء آویں تو یہ اختلاط منہی عنہ نہیں عین مطلوب
ہے اس وقت اُن سے بے رُخی نہ کرے۔ اخلاق سے پیش آوے مگر استغناء
کو اب بھی ہاتھ سے نہ دے۔ بعضے غرض مالی کے لئے ایسا کرتے ہیں کہ کسی سے
صراحۃً یا اشارۃً مانگتے وانگتے نہیں خود خدا تعالیٰ نے اُن کو ظاہری غنی بنایا ہے
مثلاً تاجر ہیں زمیندار یا کسی کوٹھی میں نقد روپیہ جمع ہے اُس سے منتفع ہوتے ہیں۔
اس وجہ سے اُن کو کسی کے سامنے حاجت پیش کرنے کی یا کسی کے ہاتھ کی طرف
دیکھنے کی نوبت نہیں آتی لیکن اپنے معاملات مالیہ میں ایسا کرتے ہیں کہ اگر شریعت
پر عمل کرنے سے اُن کی کوئی منفعت مالیہ ضائع یا مختل ہوتی ہو تو وہاں ضعیف
تاویلوں سے اور غیر مشروع حیلوں سے (گو نام اُن کا حیلہ شرعیہ رکھتے ہیں)
کام لیتے ہیں۔ اور اُس منفعت کو فوت نہیں ہونے دیتے اور اُن دنیادار مولویوں
پر یہ خصلت یہاں تک غالب ہو گئی کہ یہ جملہ عام لوگوں کی زبان زد ہو گیا کہ مولوی
اپنے مطلب کا مسئلہ جس طرح چاہیں بنا لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اگر گناہ کر کے
اپنے کو گنہگار سمجھے اور اپنے گنہگار ہونیکا اقرار کرے اس کا مفسدہ اتنا نہیں ہے جتنا گناہ
کو تاویل کر کے جائز بنانے کا مفسدہ ہے۔ عام لوگ گمراہ ہوتے ہیں علماء سے
بد اعتقاد ہوتے ہیں پھر وہ اپنے معاملات میں بھی تاویلیں اور حیلے پوچھتے ہیں اور اگر
اُن کو کوئی نہیں بتاتا تو وہ قیاس فاسد سے کام لے کر خود ہی من سمجھوتی کر لیتے ہیں
تو اُن کی تاویل بھی لغو اور مہمل ہو مگر عوام کو فرق کی تمیز کہاں۔ علماء کی تو اُن تو

یہ کہ اگر کوئی چیز بلا تاویل بھی جائز ہو مگر کسی وجہ سے اُس کے ارتکاب میں عوام کو دینی مضرت ہو تو اپنا تھوڑا ضرر دُنیا کا جسقدر تحمل ہو سکے گوارا کرلیں اور عوام کا دین بچائیں نہ کہ عوام کے لئے دروازہ فتنہ کا کھول دیں۔

دارمی میں اس مضمون کی ایک حدیث بھی ہے۔ عن زیاد بن حدیر قال لی عمر رضی اللہ تعالی عنہ هل تعرف ما یهدم الاسلام قلت لا قال یهدمه زلة العالم وجدال المنافق بالکتاب وحکم الائمة المضلین۔ لیکن اس سے کوئی شخص اُن وجوہ تصحیح معاملات پر کہ اُن کو بھی بعض کتب میں بعنوان حیلہ تعبیر کیا گیا ہے شبہ نہ کرے جنکا بلا کسی نفسانی غرض کے عام مسلمانوں کو مضائق میں سے نکالنے کے لئے اور اُن کو معاصی سے بچانے کے لئے صورت اضطرار میں اذن دیا گیا ہے جیسا خود حدیث میں بع الجمع بالدراہم ثم ابتع بالدراہم التمر ونحوہ آیا ہے۔ مابہ الفراق دونوں قسم میں یہ ہے کہ جس سے مقصود کسی مقصود شرعی کا ابطال ہو وہ مذموم اور جس سے مقصود کسی مقصود شرعی کی تحصیل ہو وہ محمود ہے۔ مثلاً ربوا کو شرع نے حرام کہا ہے۔ اس کے لئے تدبیر استعمال کرنا گناہ ہے۔ اور جس جگہ ربوا مقصود نہ ہو مگر خود اجناس ہی قیمت میں متفاوت ہوں لیکن اتحاد جنس کے سبب تفاضل ممنوع ہو اس جگہ حدیث مذکور کے موافق تصحیح کر لینا جائز اور مشروع ہے۔ یہاں تک یہ سب بیان ہوا ان اہل علم کا جو علوم دینیہ کو آلہ جلب مال کا بناتے ہیں۔

اب آگے اُن کا ذکر ہے جو علم دین کو طلب جاہ کا آلہ بناتے ہیں اور اُسکی بھی چند صورتیں ہیں۔ بعضے لوگ امراء سے ملنے کا خاص دلچسپی کے ساتھ اہتمام کرتے

ہیں اور خیال ان کا یہ ہوتا ہے کہ اُن سے ملنے سے لوگوں میں عزت و وقعت وعظمت بڑھیگی۔ حالانکہ تجربہ وتتبع خیالات جمہور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عادت سے عام لوگوں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمان اس کو اہل علم کے لئے عیب سمجھتے ہیں۔ علمار کی عزت واقع میں بھی اور عام خیال میں بھی اُسی ہی وضع پر رہنے سے ہوتی ہے جو اہل علم کی شان کے مناسب ہے یعنی خدمت دین واستغنار عن الامرار اور خوش خلقی غربار کے ساتھ لیس عامہ کی نظر میں تو کوئی وقعت نہیں ہوتی اور اُن امرار کی نظر میں تو اُس سے اچھی خاصی ذلت ہوتی ہے۔ وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ جلب مال کی طمع میں ہم سے خوشامد کے لئے ملتے ہیں سو اُن کی نظر سے بالکل ہی گر جاتے ہیں۔ اور اگر کبھی اُن کا دیا ہوا کچھ لے لیا تو رہی سہی وقعت بالکل ہی جاتی رہتی ہے یہ اثر اُن امرار پر ہوتا ہے اور ایک اثر امرار و غربار دونوں پر ہوتا ہے کہ ایسے علمار سے تحقیق دین واستغنار کے باب میں بالکل اعتبار واطمینان اٹھ جاتا ہے۔ ان کے وعظ ان کے فتوے ان کی تحریرات پر ذرا وثوق نہیں ہوتا عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاید یہ دنیاداروں کی خوشامد میں ایسا کہتے ہوں پس ان لوگوں کا علم محض غیر منتفع بہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک اعتبار سے یہ لوگ ان حدیثوں کے مصداق ہو جاتے ہیں عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم مثل علم لا ینتفع بہ کمثل کنز لا ینفق منہ فی سبیل اللہ رواہ احمد وا کذ روی عن ابی الدرداقال ان من اشر الناس عند اللہ منزلۃ یوم القیمۃ عالم لا ینتفع بعلمہ رواہ الدارمی اور ایک اثر خود ان علمار پر یہ ہوتا ہے کہ اُن اُمرار کی صحبت سے اور اُن کے منکرات پر انکا

نہ کرنے سے (کیونکہ اگر انکار اور منع کریں تو پھر اُن سے لطفِ صحبت کہاں میسر ہو سکتا ہے۔ جانبین سے انقباض ہو جاوے اور راز اس میں یہ ہے کہ اُن کو مطلوب بنا کر اُن سے ملا جاتا ہے لامحالہ اُن کی حرکات غیر مشروعہ پر سکوت کرنا پڑتا ہے۔ پس اس سکوت سے اِن علماء کے اندر ایک کیفیت مداہنت کی پیدا ہو جاتی ہے اور صحبت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُس کو ترقی ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ قلب سے پھر اس کا اثر زبان پر آتا ہے یعنی اول قلب سے حق کی عظمت اور باطل سے نفرت کم ہوتی ہے پھر زبان سے اظہار حق کی ہمت گھٹتی ہے پھر باطل کے ساتھ تکلم کرنا خفیف معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر باطل کا صدور ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ اُن اُمراء کو اسکا احساس ہو کر اس کا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اِن علماء سے اپنی نفسانی خواہش کی توجیہات کرنے کی فرمائش کرنے لگتے ہیں اور یہ اُن خواہشوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچکر اِن کا قلب مسخ ہو جاتا ہے اور حق بینی کی استعداد بالکل ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی اہل حق سے جدال اور عناد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں پھر انکی اصلاح کی کچھ توقع نہیں رہتی اور یہ لوگ امتِ محمدیہ کیلئے ابلیس سے زیادہ ضرر رساں ہو جاتے ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے اگر شیطان فارغ ہو بیٹھے تو بعید و عجیب نہیں میں نے اپنی آنکھ سے ایسے ہی ایک طالب دُنیا کا فتویٰ لکھا ہوا دیکھا ہے جس نے ایک ہزار روپیہ لے کر ایک خاص ترکیب تراش کر حقیقی ساس کے ساتھ نکاح حلال لکھ دیا تھا۔ اس حدیث میں اسی مسخ قلب کا ذکر ہے۔ عن عبد اللہ ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نہتھم علماء ھم فلم ینتھوا فجالسوھم واکلوھم

وشاربوهم فضرب الله قلوب بعضهم ببعض فلعنهم علی لسان داؤد وعیسیٰ ابن مریم ذلك بما عصوا وكانوا یعتدون الحدیث رواه ابوداؤد

اور یہ سب خرابیاں اسی وقت ہیں جب اُن امراء کو مطلوب بنا کر اُن کے پاس جاویں اُسی کی مذمت احادیث صحیحہ میں آئی ہے۔ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من ابغض القراء الی اللہ الذین یزورون الامراء رواہ ابن ماجۃ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العلماء امناء الدین مالم یخالطوا الامراء فاذا خالطوا الامراء فهم لصوص الدین فاحذروهم۔

البتہ اگر امراء طالب ہو کر اُن کے پاس حاضر ہوں یا کسی ضرورت سے خود اُنکو مدعو کریں تو اس معاہدہ کے بعد کہ ہم آزادی سے جو چاہیں گے کہہ سکیں گے اور یہ کہ ہمکو نذرانہ وغیرہ نہ دیا جائے۔ اگر اُن سے مخالطت کریں تو یہ مخالطت دین ہے۔ ورنہ اگر علماء اس طرح بھی اُن سے نہ ملیں تو اُن کو دین کیونکر پہونچے گا مگر اس طرح کا اختلاط یہ ضروری علی الکفایہ ہے اس کے لئے ایسا ہی شخص زیبا ہے جو قوی القلب غنی النفس ہو۔ ورنہ ضعیف کے لئے اسلم یہی ہے کہ امراء سے بالکل نہ ملے تبلیغ حق کے لئے دوسرے لوگ کافی ہیں۔ یا علماء کے رسائل وکتب بس ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ امراء سے اجتناب اختیار کرنے کے وقت اُن کو حقیر اور اپنے کو مقدس نہ سمجھے بلکہ اُن کو مبتلائے بلیات دنیا وجہل سمجھ کر اُن پر ترحم کرے۔ اُن کے لئے دعا کرے اور اپنے کو ضعف دین کا مریض سمجھ کر اجتناب کو ایسا سمجھے جیسا مریض ضعیف الطبع کو جس میں تاثر کا مادہ غالب ہو۔ دوسرے متعدی مرض کے مریض سے بچاتے ہیں۔

اور ساتھ ہی اس کے اُس مبتلائے مرض متعدی پر غصہ بھی نہیں کرتے بلکہ اُس پر بھی رحم کھاتے ہیں اور اپنے کو بھی بوجہ ضعف عن المرض اس سے بچاتے ہیں۔ اسی طرح ان دنیادار امرار پر بھی رحم کرنا چاہیئے کہ ایسے اسباب جہل وعصیاں میں مبتلا ہیں کہ اگر ہم اُس میں مبتلا ہوئے تو ہم بھی ایسے ہی ہوتے۔ پس اپنی عافیت پر خدائے تعالیٰ کا شکر کرے ناز نہ کرے اور ان کے لئے دعا کرے البتہ اگر کوئی شخص حق سے عناد اور اہل حق سے بغض اور تکبر کرے اُس سے بغض کرنا واجب اور عبادت ہے اور بغض فی اللہ یہی ہے۔ یہ اُن لوگوں کا بیان تھا جو طلب جاہ کے لئے اُمرار سے ملتے ہیں۔ بعضے لوگ بطلب جاہ یا بسبب جاہ ایک دوسری وضع اس کی عکس اختیار کرتے ہیں۔ دنیا داروں کو دھتکار دیتے ہیں۔ اپنے یہاں دخل نہیں دیتے اُن کو سخت وشست کہتے ہیں۔ بعضے پہرہ بٹھلا دیتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے لوگ متکبر امرار کے لئے پورا علاج ہیں۔ اور درحقیقت اُمرار کو اُن کے تکبر کی یہ سزا ملا کرتی ہے کہ وہ اوروں کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اُن کی تحقیر کرتے ہیں اور ان پر ایسے لوگ مسلط ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تکوینی علاج ہے تشریعی نہیں ایسے اخلاق رکھنا بالکل شرع کے خلاف ہے ان بداخلاقوں میں بعضے ایسے بھی ہیں کہ اُن کا یہی مقصود ہے کہ اس طریق سے امرار میں شہرت ہوتی ہے۔ لوگ بڑا بزرگ سمجھتے ہیں۔ خوب ہیبت بیٹھتی ہے اور ان لوگوں کو بہ نسبت متکبر کہنے کے ریاکار کہنا زیادہ زیبا ہے۔ یہ حدیث انہی کی نسبت ہے۔ عن ابی ھریرہ رضہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تعوذوا باللہ من جب الحزن قالوا یا رسول اللہ علیہ وسلم ما جب الحزن قال

وادٍ فی جہنم یتعوذ منه جہنم کل یوم اربع مائة مرة قیل یا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ومن یدخلہا قال القراء المراؤن باعمالہم رواہ الترمذی۔ ان لوگوں کے اس عمل کے لیے تو جاہ علت غائی ہے اور بعض کے اسی عمل کے لیے جاہ علت غائی نہیں ہوتی بلکہ علت فاعلی ہوتی ہے یعنی جاہ سبب ہوتا ہے مسبب نہیں ہوتا اور وہ لوگ ہیں جو واقع میں اپنے کو مقدس اور دوسروں کو خطا وار گنہ گار سمجھتے ہیں اس لیے ان سے نفرت کرتے ہیں ان لوگوں کو بہ نسبت ریاکار کہنے کے متکبر کہنا زیادہ بجا ہے اور یہ تکبر دنیاداروں کے تکبر سے بھی اقبح و اشنع ہے کیونکہ ان لوگوں کو بہ نسبت دنیاداروں کے زیادہ علم ہے زیادہ علم کے ساتھ بدعملی عند اللہ زیادہ مبغوض ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

فان کنت لا تدری فتلك مصیبة

وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

ان صاحبوں کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ العبرة للخواتیم مصرع

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

اور یہ لوگ اس کو استغناء سمجھتے ہیں مگر استغناء اور تکبر میں زمین آسمان کا فرق ہے جو بالکل بیّن اور ظاہر ہے۔ بعضے لوگ اپنی شہرت اور ناموری کے لیے مجادلہ اور ردّ و قدح کی عادت اختیار کر لیتے ہیں اور تعصب در و دن اسی مشغلہ میں رہتے ہیں پھر اس کا غلبہ یہاں تک ہوتا ہے کہ غیر ضروری امور میں بھی بدون نزاع کیے نہیں رہتے۔ پھر اکثروں کی تو غرض اس سے تحصیل جاہ ہوتی ہے جس کی مذمت اس حدیث میں وارد ہے عن کعب بن مالك قال قال رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم من طلب العلم لیجاری بہ العلماء او لیماری بہ السفہاء او یصرف بہ وجوہ الناس الیہ ادخلہ اللہ النار رواہ الترمذی وابن ماجہ عن ابن عمرؓ۔ بعض اوقات اس کا یہاں تک اثر ہوتا ہے کہ حق واضح ہونے کے بعد بھی اپنے باطل پر اصرار کئے جاتے ہیں کہ بات ہیٹی نہ ہو جائے۔ میں نے ایک مناظر کا فتویٰ ایک قطعی رضاعی رشتے میں حلت نکاح کا دیکھا ہے کہ ابتداء میں تو اُن سے غلطی ہوگئی تھی مگر پھر اپنی بات کی پچ پڑی اور باوجود سارے جہان کے علماء کے خلاف کرنے کے اور تحریراً و تقریراً متنبہ کرنے کے ہرگز رجوع نہ کیا اور بعض ثقات سے مسموع ہوا کہ اُن بزرگ نے اپنے ایک معتقد سے یہ کہا کہ اب کیا کروں قلم سے نکل گیا ہے اب تو تائید ہی کرنا ضرور ہے اور بعض خود اس کو مقصود اور دین کا کام سمجھ کر کرتے ہیں اس کی مذمت اس حدیث میں ہے۔ عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ضل قوم بعد ھدی کانوا علیہ الا اوتوا الجدل ثم اقرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذہ الاٰیۃ ما ضربوہ لک الا جدلا بل ھم خصمون رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ اس حدیث کا حاشیہ بھی قابل ملاحظہ ہے: المراد بالجدل ھھنا العناد والمراد التعصب لترویج مذھبھم من غیر ان یکون لھم نصرۃ علی ما ھو الحق وذلک محرم۔ اور جس طرح اس عمل کی مذمت آئی ہے اُسی طرح اُس کے ترک کی فضیلت و مدح آئی ہے۔ عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترک الکذب وھو باطل بنی لہ فی ربض الجنۃ

ومن ترك المرآء وھو محق بنی لہ فی وسط الجنۃ ومن حسن خلقہ بنی لہ فی اعلاھا رواہ الترمذی۔ اور اگر کسیکو شبہہ ہو کہ قرآن مجید میں جادلھم بصیغہ امر آیا ہے اور لا تجادلوا کے بعد استثناء الا بالتی ھی احسن آیا ہے اور خود احادیث میں محاجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصاریٰ سے جس کی تائید میں سورۂ آل عمران کی شروع کی آیتیں نازل ہوئی ہیں وارد ہے اور ائمہ دین نے سلفاً و خلفاً اہل بدعت سے محاجہ کیا ہے اور بہت سی تصانیف اُن حضرات کی اس باب میں ہیں اور علم کلام اسی غرض سے ایک مستقل اور مدون فن ہو کر باجماع علماء امت علوم دینیہ میں داخل ہو گیا ہے۔ نیز ضرورت بھی اس کی مشاہد ہے کیونکہ اہل باطل ہر زمانہ میں بکثرت موجود رہے ہیں اور اب بھی ہیں اور وہ لوگ اپنے باطل کی ہمیشہ ترویج کرتے ہیں تو اگر اُن کا جواب نہ دیا جاوے تو عوام کا تلبیس و تخلیط میں پڑ جانا کچھ بھی بعید و عجیب نہیں اور جواب دینے میں عوام کی بھی حفاظت ہے اور بعض اوقات خود اہل باطل کو بھی ہدایت ہو جاتی ہے اور یہی قیل و قال و جواب و سوال مجادلہ و مناظرہ ہے تو ایسے ضروری امر کو مذموم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ہر مجادلہ کا مذموم ہونا اور ہر حالت میں مذموم ہونا ہمارا ادعا نہیں بعض مجادلات و حالات مستثنیٰ بھی ہیں اور دین میں انہیں کا اذن بھی ہے اُن کے سوا باقی مذموم ہیں یا اُن کا ترک محمود ہے۔ مگر ہمارے زمانہ میں تو زیادہ افراد اسی مجادلہ مذموم یا محمود الترک کے پائے جاتے ہیں جن کی مذمت حدیثوں میں اور نیز آیات اور کلام اکابر میں موجود ہے۔ حدیثیں تو بعض اوپر گذر چکی بعض آیات یہ ہیں۔ فلا تمار فیھم

الامراء ظاہر اور ولا تستفت فیہم منہم احداً اور فلا ینازعنک
فی الامر وادع الی ربک انک لعلی ھدی مستقیم وان جادلوک
فقل اللہ اعلم بما تعملون اللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ فیما کنتم
فیہ تختلفون اور ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی
ولا کتاب منیرا اور فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم
فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا
وانفسکم ثم نبتہل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

اور اقوال اکابر ائمہ کے اس کے ذم ~~میں~~ علم کتب کلامیہ اور احیاء العلوم وغیرہ
میں منقول ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ مسئلہ دو قسم کا ہے ایک وہ جسکی ایک جانب
یقیناً حق اور دوسری شق یقیناً باطل ہو سمعاً یا عقلاً یہ مسائل قطعیہ کہلاتے ہیں۔
ایک وہ جس میں جانبین میں حق اور صواب اور خطا و غلط دونوں محتمل ہوں یہ مسائل
ظنیہ کہلاتے ہیں۔ مسائل کلامیہ اکثر قسم اول سے ہیں اور بعض قسم ثانی سے اور مسائل
فقہیہ اکثر قسم ثانی سے ہیں اور بعض قسم اول سے جیسا متتبع پر مخفی نہیں پس مسائل
ظنیہ محتملۃ الخطاء والصواب ہیں۔ خواہ وہ از قسم مسائل کلامیہ ہوں۔ یا
از قبیل مسائل فقہیہ صرف اثبات ترجیح ظنی کے لئے نہ اہل علم کی باہم مکالمت
بلا بغض و عناد و بلا اعتقاد قطع ایک جانب کے وبلا قصد ابطال جازم دوسر
جانب کے ور بعزم رجوع و قبول حق کے جب سمجھ میں آجاوے مگر جائز ہے مگر
مصلحت یہ ہے کہ عوام تک اس کی اطلاع نہو اگر زبانی گفتگو ہو تو مجمع خواص میں
ہو اور اگر تحریری ہو تو عام فہم زبان میں مثلاً ہندوستان میں اردو میں نہو عربی میں

عہ ~~ہے~~ برائی ۱۲ حافظ

ہو یا کم از کم فارسی میں ہوتا کہ اگر کسیوقت وہ تحریرات شائع کی جاویں تو عوام پر اس اختلاف سے کوئی اثر نہ پہونچے اور سلف سے ان مسائل میں اسی طرح کی گفتگو منقول ہے نہ وہ گفتگو جو آج کل ہوتی ہے کہ ایک قرأۃ فاتحہ خلف الامام کا حق ہونا اس طرح تبلا رہا ہے کہ اس کے نزدیک تمام حنفیہ تارک صلوٰۃ اور فاسق ہیں۔ اور دوسرا اُس کی نفی اس طرح کر رہا ہے کہ گویا اُس کے نزدیک قراۃ خلف الامام میں کوئی حدیث ہی نہیں آئی اور عین مناظرہ میں اگر مقابل کا قول دل کو بھی لگ جائے تب بھی ہرگز قبول نہ کریں جس طرح بن سکے اس کو رد کریں بلکہ مقابل کی گفتگو شروع ہونے کے ساتھ ہی ردہی کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں۔ اور اول سے اسیکے سوچ میں رہتے اور اسی نیت سے سنتے ہیں کیونکہ تمام تر مقصود اپنا غلبہ اور دوسرے کا اسکات ہوتا ہے۔ پھر باہمی عناد وفساد حتےٰ کہ نوبت بعدالت پہونچتی ہے یہ علاوہ ہے۔ کیا یہ دین ہے۔ کیا یہی طریقہ سلف صالحین کا ہے۔ کیا حضرات صحابہؓ سے ان مسائل میں ایسا غلو ثابت ہے۔ یہ تو مسائل ظنیہ کے متعلق بیان ہوا۔ اب رہ گئے مسائل قطعیہ متعینۃ الصواب جیسے کفر واسلام کا اختلاف یا سنت وبدعت متفق علیہا عند اہل الحق کا اختلاف اس میں چند حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ صاحب باطل متردد اور طالب اور جویا حق کا ہے اپنے شبہات کو صاف کرنا چاہتا ہے اور اس غرض سے مناظرہ کرتا ہے۔ یہ مناظرہ قادر علی تائید الحق پر واجب اور فرض ہے۔ اور جب جواب سے عجز ہو صاف کہدینا چاہیئے کہ اس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں سوچکر یا پوچھکر بتلاؤنگا یا اپنے سے زیادہ جاننے والے کا پتہ تبلادے۔ اور اس طالب کو چاہیئے کہ وہاں

جا کر رجوع کرے اور قدرت ہوتے ہوئے ایسے مناظرہ سے انکار کرنا معصیت ہے۔ یہ حدیث اس کو بھی شامل ہے۔ من سئل عن علم فکتمہ الخ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب نہیں لیکن متکلم مناظرہ کو توقع و احتمال ہے کہ شاید مخاطب قبول کرلے۔ سو جب تک اس کی امید ہو مناظرہ کرنا تبلیغ احکام میں داخل ہے۔ جہاں تبلیغ واجب ہے وہاں یہ بھی واجب ہے اور جہاں تبلیغ مستحب ہے یہ بھی مستحب ہے۔ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مناظرات اہل کتاب وخوارج وغیرہم اسی قبیل کے تھے۔

اور تیسری حالت یہ ہے کہ وہ طالب بھی نہیں اور اُس کے قبول کی بھی امید نہیں مگر کسی مفسدہ و مضرت کا اندیشہ بھی نہیں اور کسی ضروری امر میں خلل بھی محتمل نہیں تو اس حالت میں ایسا مناظرہ مستحب ہے۔ اور چوتھی حالت یہ ہے کہ نہ طالب ہے نہ قبول کی امید نہ کسی ضروری امر میں خلل کا احتمال۔ مگر خاص مضرت کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں قوی الہمۃ کے لئے عزیمت واولیٰ ہے اور ضعیف الہمۃ کے لئے رخصت اور غیر اولیٰ ہے۔ اور پانچویں حالت یہ ہے کہ نہ طالب نہ توقع قبول اور ساتھ ہی کسی دینی مضرت کا احتمال ہے یا دینی منفعت مہمہ کا فوت محتمل ہے۔ اس صورت میں اس سے اعراض اور ضروری میں اشتغال واجب ہے۔ قرآن مجید میں اعراض و ترک جدال کا امر ایسے ہی مواقع پر ہے۔ سورہ عبس کا شان نزول جو قصہ تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے اُس کو تیسری حالت میں داخل سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے اُسکو پانچویں حالت میں داخل بتلایا اور چونکہ اسمیں داخل ہونا خفی تھا اس لئے ترک واجب

کا شبہہ نہیں کیا جا سکیگا چھٹی حالت یہ ہے کہ مناظرہ کرنے میں تو مخاطب کی نہ کوئی منفعت متوقع اور نہ اُس سے کسی خاص مضرت کا احتمال اور مناظرہ نہ کرنے میں عوام اہل حق کے شبہہ میں واقع ہو جانے کا خوف ہو اور مسئلہ ایسا ہو کہ عوام اہل حق کو اُس کے غلط ہونے کا احتمال بھی نہ ہو تا کہ علمائے اہل حق سے دریافت کر سکیں تو اس صورت میں اُس کی تدبیر واجب ہے۔ اس کی دو تدبیریں ہیں۔ ایک یہ کہ خود اہل باطل کو مکالمہ یا مکاتبہ میں مخاطب بنایا جاوے دوسری تدبیر یہ کہ اس سے خطاب نہ کیا جاوے بلکہ عام خطاب سے حق کو ثابت اور باطل کو رد کیا جاوے۔ پس یہ دونوں تدبیریں واجب علی التخییر ہیں۔ ان میں سے جس تدبیر کو اختیار کر لیا جاوے گا واجب ادا ہو جاوے گا۔ ساتویں حالت یہ ہے کہ قیود مذکورہ حالت ششم کے ساتھ وہ مسئلہ بھی ایسا ہو کہ عوام اہل حق کو اُس کے غلط ہونے کا شبہہ واقع ہو سکتا ہو۔ اس صورت میں خود اُن (عوام) پر واجب ہے کہ علماء سے تحقیق کریں اور اُن کے استفسار کے وقت علماء پر جواب دینا واجب ہوگا ورنہ بدون سوال وہ سبکدوش ہیں اور ان تمام صورتوں میں یہ واجب ہے کہ الفاظ اور مضمون متانت اور تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ اگر دوسرا بھی سختی کرے تو صبر افضل ہے۔ یہ تمام تر تفصیل و تقسیم مذکور ان امور میں ہے جو شرعاً مقصود ہوں بعض وہ امور ہیں جو شرعاً مہتم بالشان نہیں۔ جیسے خاندان چشتیہ و خاندان نقشبندیہ کا باہم متفاضل ہونا یا بعض وہ امور ہیں جن میں بحث کرنے یا حکم لگانے سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے۔ جیسے تقدیر کا مسئلہ یا کوئی دوسرا مسئلہ جو اسی کی نظیر ہو یا جیسے باوجود اس کے کہ کسی کا کلام محتمل معنی

صحیح کو ہو پھر اسپر کفر کا حکم لگانا۔ ان میں بحث و مباحثہ کرنا منہی عنہ اور مذموم ہے۔ عَلیٰ اختلاف مراتب النہی والمنہی عنہ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ نہ ہر مناظرہ محمود ہے نہ مذموم ہے اور اس تقریر سے تمام اُن نصوص و اقوال و عادات ائمہ دین میں جو اس باب میں بظاہر متعارض نظر آتے ہیں تطبیق ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ زیادہ مناظرے اس زمانہ میں وہی شائع ہیں جو مذموم ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ مناظرہ کا جواز ان شرائط سے مقید ہے کہ وہ مسئلہ دین میں متعصب بھی ہو۔ دل سے یہ عزم ہو کہ حق واضح ہو جاویگا تو فوراً قبول کرلینگے یہ نیت نہو کہ ہر بات کو رد کرینگے گو سمجھ میں آجاوے۔ مخاطب پر شفقت ہو اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو تو صبر اور معدلت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ اگر قرائن سے عناد مشاہد ہو تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرکے ترک کردے۔ الفاظ اور مضمون نرم ہو۔ جو بات معلوم نہو۔ نہ جاننے کے اقرار سے عار نہ کرے وغیرہ ذالک مما ذکر فی التقریر المبسوط المار آنفا۔ اور جہاں یہ شرائط نہ ہونگے جیسا آج کل مشاہد ہے وہاں مناظرہ بجائے نافع ہونے کے بالیقین مضر ہو گا۔ جیسا آج کل اُس کی مضرتیں محسوس ہو رہی ہیں وہ یہ کہ اُن فضول لایعنی قصوں کو دیکھ کر عوام الناس علما سے بدگمان ہو گئے ہیں کہ میاں ہر شخص دوسرے کی تکذیب کر رہا ہے۔ پھر وہ بزعم خود اذ التعارضا تساقطا پر عمل کرکے سب ہی کو چھوڑ دیتے ہیں یا ایک کی طرف ہو کر دوسرے مقابل کی بے آبروئی اور ایذا رسانی کے درپے ہوتے ہیں اور باہمی عداوت قائم ہو کر جانبین میں غیبت کا دروازہ الگ کھلتا ہے اور ایک دوسرے کی بے آبروئی کی فکر میں الگ لگے رہتے ہیں اور گروہ بندی

ہو کر مسلمانوں کی قوت اور وقعت میں روزانہ ضعف اور انحطاط ہوتا جاتا ہے۔ کبھی عوام میں باہم مارپٹائی ہو کر نوبت بعدالت پہونچتی ہے اور ہزاروں روپیوں پہ پانی پھر جاتا ہے۔ بعض اوقات ان جھگڑوں کی بدولت عدالت میں علماء بلائے جاتے ہیں اور وہاں دینی کتابیں لائی جاتی ہیں جن کا وہاں کوئی ادب نہیں ہوسکتا۔ پھر بعض اوقات وہ مسائل ایسے فیصل کرنے والے کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ جس کو دینیات سے مس بھی نہیں پھر وہ جاہل عالموں کا فیصلہ اوٹے پٹانگ کرتا ہے اور اس جھوٹ کے سبب یہی متنازعلین ہوتے ہیں۔ پھر اکثر ایسے مقدمات کا سلسلہ سالہاسال جاری رہتا ہے اور اس مدت میں فریقین ضروری کاموں سے معطل ہوجاتے ہیں اور پھر دوران معاملہ میں جو جو امور منکرہ اختیار کرنے پڑتے ہیں جھوٹے اور فریب اور چالاکی جھوٹے گواہ بنانا جھوٹے حلف بنانا اٹھانا اور پھر اسکا اثر علماء پر پڑتا ہے اور پھر اس سبکو دیکھ کر مخالفین اسلام کی نظر میں جو ذلت اور خندیدگی اور شماتت ہوتی ہے وہ مخفی نہیں۔ پھر ایک بہت بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اگر متخاصمین سے ایک منصف مزاج ہوا اور اُس نے دوسرے کی تقریر کے کسی جزکو مان لیا یا جواب صحیح سوچتا ہوا رہ گیا یا حق پرستی کے سبب کہہ دیا کہ مجھکو اس کا جواب معلوم نہیں کسی سے دریافت کرلوں گا یا پھر سوچکر یا دیکھ کر بتلاؤنگا تو عوام جہلا کے نزدیک گویا وہ ہار گیا اور زیادہ تماشہ دیکھنے والے عوام ہی ہوتے ہیں اور اس کے ہارنے کے ساتھ اُس کا دعویٰ کیا ہوا مسئلہ بھی غلط ہوگیا۔ ان مفاسد کے ہوتے ہوئے تو مستحب بھی منہی عنہ ہوجاتا ہے چہ جائیکہ جب وہ فی نفسہ بھی بوجہ فقدان شرائط مذموم ہو۔ البتہ اگر کوئی فرد مناظرہ کی بوجہ وجدان

شرائط شرعاً مطلوب ہو گو اُس میں اس قسم کے مفاسد بھی ہوں تو اُسکا ارتکاب کیا جائیگا اور مفاسد کا حتی الامکان انسداد کرینگے جسکا انسداد خارج از اختیار ہو کچھ پرواہ نہ کریں گے۔

بعض لوگ ان شرائط و مفاسد سے غض بصر کر کے آج کل کے مناظروں کی مصلحتیں بیان کیا کرتے ہیں۔ اس تقریر میں غور کرنیسے ان سب کا جواب بھی نکل آئیگا۔ نمونہ کے طور پر بعض جزئیات کو ذکر بھی کیے دیتا ہوں۔ مثلاً بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مناظرہ نہ کرنیسے عوام الناس کے اعتقاد میں خلل پڑ جاتا ہے جواب یہ ہے کہ اگر خاص اس مناظرہ نہ کرنے والے سے بد اعتقاد ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی دینی مضرت نہیں ایسا کیں ہے ہر نبیؐ کا ماننا فرض ہے۔ علماء میں سے ہر عالم کا ماننا فرض نہیں ہے اور اگر اُس خاص مسئلہ میں ان کا اعتقاد بدل جاتا ہے یا تذبذب میں پڑتے ہیں تو اگر وہ مسئلہ محل اجتہاد ہے تو اعتقاد کا بدل جانا کچھ مضر نہیں اور اگر وہ محل اجتہاد نہیں تو تصحیح اُن کے اعتقاد کی مناظرہ ہی میں منحصر نہیں مستقل و ابتدائی تقریر یا تحریر سے سمجھانا ممکن ہے یا خود اُن عوام کے ذمہ بھی واجب ہے کہ اپنے تردد و تذبذب کو علماء سے رجوع کر کے رفع کر لیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ یہ بار بھی علماء ہی کے ذمہ ڈالا جائے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مناظرہ سے حق واضح ہو جاتا ہے۔ یہ مصلحت بھی مصلحت بالا کے قریب قریب ہے صرف عنوان ہی کا تفاوت ہے تو جواب یہ ہے کہ آجکل کا مناظرہ کسی طرح معیار تعیین حق کا نہیں ہو سکتا۔ اگر اُس کو معیار قرار دیا جائے کہ جو ساکت اور مغلوب ہو جائے وہ باطل پر ہے اور جو بولنے میں غالب ہے وہ حق پر ہے سو یہ تو بالکل غلط بعض اوقات صاحب حق کو بوجہ جواب کے حاضر نہ ہونے کے یا اُس شخص کے حاضر جواب نہ ہونے کے یا بوجہ

متکلم بالباطل کی اُلجھی ہوئی تقریر سے پریشان و منتشر ہو جانے کے یا اُس کی بدزبانی سے مشتعل و غضبناک ہو جانے کے یا نظر اور فکر فی الجواب میں مشغول ہو جانے کے فی الوقت سکوت ہو جاتا ہے تو کیا اس سکوت سے وہ حق مبدل بباطل ہو گیا۔ غرض جس طرح محاجہ بالسنان میں بقول الحرب سجال کبھی ایک غالب کبھی دوسرا غالب ہو جاتا ہے اسی طرح محاجہ باللسان میں بھی مشاہد ہے سو کبھی تو ان عوارض سے صاحب حق کو سکوت ہو سکتا ہے گو آخر میں خود اس مناظر کے واسطے سے یا دوسرے اہل حق کے واسطے سے غلبہ حق ہی کو ہوتا ہے یا اہل باطل کو سکوت ہو جاویگا یا اہل فہم پر اس کا باطل ہونا معلوم ہو جائیگا مگر اس کے لئے ابتدائی خطاب بھی کافی ہے مناظرہ کی حاجت نہیں۔ اور بعض اوقات کسی جانب بھی سکوت نہیں ہوتا یا تو اُس مسئلہ کلام کی مجال وسیع ہے یا بقول۔ "ملا آں باشد کہ چپ نشود" ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے اور ہر شخص دوسرے کا جواب پھر وہ دوسرا اسکا جواب الجواب پھر وہ پہلا اُس جواب الجواب کا رد پھر وہ دوسرا اسکا رد کا رد وھلم جرا دونوں اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں۔ چنانچہ مسائل اختلافیہ میں دھور و اعصار گذر گئے اور بار بار شتر کتابیں ہو گئیں مگر آج تک کسی فریق کو سکوت نہیں ہوا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے۔ اور اگر اس طرح معیار قرار دیا جاوے کہ گو سکوت کسی کو نہ ہو یا فی الوقت صاحب حق کو سکوت ہو جاوے مگر طالبین حق کے جو متردد ہیں دونوں کی بات سنکر تصفیہ و فیصلہ کر لیں گے۔ اور حق و باطل میں تمیز کر لیں گے سو اول تو عوام الناس کا فیصلہ کہاں تک قابل اعتبار ہے جب فہم نہ ہو ممکن ہے کہ باطل

والے کی تقریر کو وہ سمجھ لیں اور اہل حق کی نہ سمجھیں۔ دوسرے اگر وہ عامی فہیم ہے تو اس کے لئے مناظرہ ہی کی کیا ضرورت ہے مستقل تقریر کو سنتا سنانا بھی اس غرض کیلئے کافی ہوسکتا ہے جیسا ابھی اوپر بیان ہوا بعض لوگ کہتے ہیں کہ علماء کلام نے ہمیشہ مناظرہ کیا ہے۔ سو اول تو بعض اکابر نے بعض وجوہ کلام پہ خود انکار بھی کیا ہے جیسا احیاء العلوم وغیرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پھر جو طرق مقبول ہوئے ہیں وہ ایسے نہیں جیسا آج کل کا طرز ہو گیا ہے۔ کتابیں دیکھ لیجئے ہر کسی تہذیب و متانت سے مخالف پر رد کیا ہے اور ضروری پر اکتفا کیا ہے نہ ضلع ہے نہ جگت ہے نہ پھکڑ ہے نہ ہر ہر لفظ کا رد ہے نہ لایعنی الفاظ یا مضامین ہیں۔ نہ لفظی مواخذات ہیں نہ عنادی مناقشات ہیں۔ مخالف کے وجوہ محتملہ کا خود ابداء کرتے ہیں جو قابل قبول ہو مان لیتے ہیں۔ جو قابل رد ہو طریقہ حسنہ سے رد کرتے ہیں سو کہاں یہ مناظرہ اور کہاں آج کل مشاجرہ ان دونوں کے فرق کے لئے بےساختہ یہ مصرع یاد آتا ہے۔

مصرع۔ انچہ مردم میکند بوزینہ ہم

یہ بحث ضروری تھی مجادلین کے باب میں جنکی غرض طلب جاہ یا بزعم خود خدمت دین ہے جس پر اس آیۃ کا پڑھنا بالکل صحیح ہے افمن زین لہ سوء عملہ فراٰہ حسنا بعضے لوگ وعظ کو طلب جاہ کا آلہ بناتے ہیں جیسے بعضے اس کو طلب مال کا آلہ بناتے ہیں جن کا ذکر اس فصل کے شروع میں ہو چکا ہے۔ حدیث میں سکی مذمت آئی ہے عن عوف بن مالک الاشجعیؓ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا یقص الا امیر او مامور او مختال رواہ ابوداؤد ورواہ الدارمی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ وفی روایۃ او

مراء بدل اور مختال۔ وعن ابی هریرۃ رض قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من تعلم صرف الکلام لیسبی بہ قلوب الرجال او الناس لم یقبل اللہ یوم القیمۃ صرفا ولا عدلا رواہ ابو داؤد اور ایسا شخص اُس قاصد مال سے بھی بدتر ہے کیونکہ طالب مال طبعًا اپنے کو ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اور یہ شخص اپنے کو بڑا اور مال نہ لینے کے سبب اپنے کو مقدس سمجھتا ہے اور ایسے شخص کے وعظ میں مسلمانوں کی تحقیر اور ایذا اور طعن بلکہ سب وشتم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا بلکہ بڑا حصہ اس کے وعظ کا یہی ہوتا ہے علماء ورثہ ہیں انبیاء علیہم السلام کے اُن کو ویسی ہی شفقت امت پر ضروری ہے اور ایک مشترک خرابی طالب مال وجاہ واعظین میں یہ ہے کہ بدون کافی علم کے وعظ کہنے لگتے ہیں اور مسئلہ پوچھنے پر کبھی نہیں کہتے کہ ہم نہیں جانتے خود اس پر بھی وعیدیں مثل ضلوا واضلوا کی وارد ہیں اور حدیث مذکور لا یقص الخ سے محققین و مخلصین واعظین پر شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ نہ امیر ہیں نہ ماموربن الامیر پس یہ بھی مختال ہوں گے۔ جواب یہ ہے کہ عام اہل ایمان کی رغبت والتجاء بجائے امر من الامیر کے ہے کیونکہ امیر کی امارت بھی اسی اتفاق پر مبنی ہے۔

حاصل فصل کا یہ ہے کہ علم دین پڑھ کر اُس کو آلہ دنیا کا مال کا یا جاہ کا بنانا علماء سوء میں داخل ہونا اور اُمت کیلئے مضر بننا ہے۔ مال اور جاہ بقدر ضرورت دوسرے ذرائع سے حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ بلا اکتساب ہی اللہ تعالیٰ مخلصین متقین کو عطا فرماتے ہیں۔ جیسا وعدہ ہے۔ قال اللہ تعالیٰ ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب وقال اللہ تعالیٰ ھم الذین

يقولون لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا و لله خزائن السموات والارض.

تیسری فصل مدارس کی بعض اصلاحات میں۔ اس میں تو ذرا شبہ نہیں کہ اس وقت مدارس علوم دینیہ کا وجود مسلمانوں کے لئے ایک ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہیں۔ دنیا میں اگر اسوقت اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں۔ ان کو بیکار بتلانے والا معلوم ہوتا ہے ابھی تک اسلامی ضروریات سے اور مدارس کے اثر سے محض بے خبر ہے۔ مختصر بیان اس کا یہ ہے کہ اسلام نام ہے خاص عقاید اور خاص اعمال کا جس میں دیانات و معاملات و معاشرات و اخلاق سب داخل ہیں اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم دین پر اور علوم دینیہ کا بقاء ہر چند کہ فی نفسہ موقوف نہیں ہے مدارس پر مگر باعتبار عوارض وقتیہ عادۃً ضرور موقوف ہے مدارس پر۔ جس شخص کو تجربہ ہوگا وہ اس حکم میں ذرا توقف نہیں کرسکتا اور جسکو توقف ہو وہ تجربہ کرسکتا ہے اس لئے اس میں تطویل کلام کی حاجت نہیں سمجھی گئی۔ غرض بالیقین یہ مدارس خدا تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت اور بہت بڑی نعمت ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم جیسے بعض عمال و خدام کی سوء تدبیر سے ان مدارس میں متعدد امور ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ اور اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت معترضین کا ہدف ملامت بھی بنتی ہے۔ اور خود روح مدارس کہ ان کی اقامت کی غایت ہے یعنی عمل بالدین وہ بھی ضعیف ہوجاتی ہے اور نیز ان امور کو دیکھ کر دوسروں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ لوگ علوم دینیہ سے متوحش اور نفور ہوجاتے ہیں اور بسبب اس کا جماعت

اہل علم کی ہوتی ہے تو گویا درجہ تسبب میں یصدون عن سبیل اللہ کے مصداق میں داخل ہوتے ہیں اس لیے اُن امور کی اصلاح کے متعلق مختصرًا عرض کرکے اہل علم کو ان کی اصلاح کی طرف متوجہ کرتا ہوں اور اگر میری کوئی رائے خلاف تحقیق ہو تو اُس کے عرض کرنے سے معافی چاہتا ہوں۔

اس وقت جو اُمور ذہن میں ہیں وہ یہ ہیں:

ا۔ بعض جگہ چندہ فراہم کرنے میں قواعد شریعت و مروت کے خلاف کیا جاتا ہے جسکا بیان بقدر ضرورت باب ہذا کی دوسری فصل میں ہوا ہے اسی کے فروع میں سے ایک وہ رسم ہے جو بعض برادریوں میں التزام کے طور پر مقرر ہے کہ جب ان میں شادی ہو تو مدرسہ کے لئے کوئی خاص رقم ضرور نکالی جائے واقعات کی تفتیش سے ثابت ہوا ہے کہ اسمیں اکثر ثقل اور جبر ہوتا ہے اگر کسی نے مانگ لیا تب تو ظاہر ہی ہے اور اگر نہ بھی مانگا تب بھی احتمال غالب ہے کہ یہی سمجھ کر دیتے ہیں کہ نہ دینے سے تمام برادری کے خلاف ہوگا بات ہلکی ہوگی۔ اس لئے گو دل نہ چاہے مگر ضرور دیتے ہیں۔ میں نے اسکا اچھی طرح تصریح کرا کر تجربہ کیا ہے۔ لوگوں نے صریح اقرار کراہت کا کیا برادری میں جن لوگوں کو فرد خرچ کا لکھنا سپرد ہوتا ہے وہ اس کا لحاظ رکھیں کہ مدرسہ کا اور اسی طرح مسجد کا مد اُس میں ہرگز نہ رکھیں۔ ہرچند کہ تمام مدات اسی فرد کے ہی حکم رکھتے ہیں اور اُسکے واسطے سے ان رقوم کا وصول کرنا ہرگز جائز نہیں مگر مسجد و مدرسہ میں ایسی رقم کا لگانا اور بھی برا ہے کہ حدیث ہے ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب یعنی دین کے کام میں ایسی رقم لگانا جو بطیب غیر مشروع

وصول کی گئی ہو اور بھی زیادہ مذموم ہے۔ اسی طرح بعض دہات میں ہل پیچھے کچھ غلہ مقرر ہو جاتا ہے۔ اس میں علاوہ مبلغ احتیاطی مذکور کے بعض جگہ یہاں تک بے احتیاطی ہوتی ہے کہ اگر اس ہل کا کھیت کسی یتیم کا ہو اُس سے بھی وہ حصہ لے لیتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں۔ اسی کے فروع میں سے ایک یہ ہے کہ دوامی چندہ میں بعد موت وعدہ کرنے والے کے اُس کے ورثہ اُس چندہ کو جاری رکھتے ہیں اور اہل مدارس اس کی تحقیق نہیں کرتے کہ ان لوگوں نے اپنے ملک مختص سے اس کو جاری رکھا ہے یا ترکہ مشترکہ سے اور اس ترکہ مشترکہ میں کوئی یتیم یا غائب یا غیر راضی تو نہیں ہے۔ اسی طرح میت کے کپڑوں کو مدرسہ میں دینے کے وقت اس میت کے ورثہ اور اُن کے بلوغ اور رضا کی تحقیق نہیں کی جاتی۔

۲۔ چندہ دوامی میں جو آخر سال میں بقایا واجب رہ جاتا ہے۔ میرے نزدیک اُس بقایا کا طلب کرنا منکر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اظہار ہے صاحب چندہ کی نادہندی و خلف وعدہ کا۔ میں نے مدرسہ کانپور میں اس کی اس طرح اصلاح کی ہے کہ روئداد میں صرف وصول شدہ چندہ لکھا جاتا تھا اور بقایا کو مدرسہ کے خاص رجسٹر میں محفوظ رکھا جاتا تھا جسکی یاددہانی بذریعہ خط کے خاص طور پر کردی جاتی تھی۔ اور میرے نزدیک یاددہانی میں ضرور ہے کہ لزوم و تاکد کے الفاظ نہوں بلکہ تصریح کردیجاوے کہ آپ کو اطلاع کی جاتی ہے اگر رغبت ہو بھیجدیجیئے ورنہ آپ آزاد ہیں۔ اور یہ کبھی خیال نہ کیا جاوے کہ اس طرح پھر کون دیتا ہے یہ سب غلط خیال ہے جتنا آنا ہوتا ہے آتا ہے اس کا کامل تجربہ ہو چکا ہے ہرگز وسوسہ نہ کیا جاوے۔

۳ - بعض رقوم جو واجب التملیک مدرسہ میں آتی ہیں اور ضرورت ہوتی۔ مدرسہ کے مدات غیر واجب التملیک میں تو اُس میں ایک حیلہ تملیک کا کیا جاتا ہے جو سب کو معلوم ہے لیکن چونکہ جانبین کو معلوم ہے کہ اسمیں تملیک حقیقۃً ہرگز مقصود نہیں جسکا ایک امتحان یہی ہے کہ اگر وہ مسکین بعد قبضہ کے پھر داخل مدرسہ نہ کرے تو اسوقت دیکھیے کسقدر بے لطفی و بدمزگی ہوتی ہے بلکہ عجب نہیں کہ اُس سے چھین لیا جاوے۔ یا تمام عمر کیلئے اُس کی صورت سے بیزار ہو جاویں تو اگر وہ تملیک حقیقی تھی تو پھر اس جبر کے کیا معنی۔ اور اگر تملیک نہیں تو واجب یعنی زکوٰۃ وغیرہ ادا نہیں ہوا تو معطی نے مہتمم کو امین سمجھ کر وہ رقم اس کے سپرد کی۔ اور اس نے اس طرح اُس کو ضائع کیا۔ اگر مدات غیر واجب التملک ہی میں صرف کرنا ہو تو اُس کی ایک اور صورت اس سے بہتر ہے گو وہ بھی خلوص کے خلاف ہے مگر قواعد کے خلاف نہیں۔ وہ یہ کہ کسی مسکین کو مشورہ دیا جاوے کہ وہ مثلاً پچیس روپیہ کسی سے قرض لے کر مدرسہ کے اُس مد ضروری الوقت میں تبرعاً دیدے اور پھر مہتمم وہ رقم واجب التملیک اُس مسکین کو بتملیک حقیقی بغرض اعانت ادائے قرض کے دیدے۔ پھر قرض خواہ اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے اور اگر نہ دے تو اُس سے چھین لینا جائز ہے۔

۴ - بعض لوگ رقوم چندہ میں اس طرح بیجا اخراجات اور خلاف اذن تصرفات کرتے ہیں جیسے گویا اُن کی ملک ہے۔ اس میں بہت احتیاط کرنا چاہیئے تفصیل اسکی خود واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

۵ - اکثر جگہ جہاں طلبہ کو لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں طلبہ کیلئے معیوب ہے کہ کسی

کے گھر پر کھانا لینے جاویں کہ اس میں سخت تحقیر واہانت ہے علم اور اہل علم کی نیز اس میں ایک اخلاقی خرابی ہے وہ یہ کہ دوسرے سے مانگنے میں انقباض طبعی یعنی جھجک نہیں رہتی دل کھل جاتا ہے اور یہی انقباض طبعی حیار کی ایک بڑی فرد ہے۔ جو مانع ہے انسان کو سوال مذلت سے ۔ جب یہ نہ رہی تو اب اسکا سوال سے رُکنا عقلاً ہوگا طبعاً نہ ہوگا ۔ اور غرض ایک ایسی چیز ہے جو مانع عقلی کو بہت جلد رفع کردیتی ہے۔ ایسے وقت مانع طبعی ہی کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ نہ رہی تو اس شخص کو جب موقع ہوگا بے تکلف لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیگا تو گویا عمر بھر کے لئے اسکا ایک کمال فطری برباد ہوگیا۔ پھر جب اس شخص کی قدر و منزلت کسی کے دل میں نہ رہی تو اس کا وعظ وارشاد کیا نافع و موثر ہوگا ۔ اسلئے میری رائے (جسپر میں پہلے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں اور اب مدرسہ تھانہ بھون میں کاربند بھی رہا اور ہوں) یہ ہے کہ اس طریقہ کو بند کردیا جاوے ۔ جو شخص طالب علم کو کھانا دینا چاہے وہ مدرسہ میں بھیجدے ۔ اسی طرح دعوت میں بھی طلبہ کو نہ بھیجا جائے جس شخص کو کھ . . . . باضیعۃ میں لاکر کھلاوے ۔ اس . . . سے اُنکی عزت بھی محفوظ رہیگی اور خود اُن میں بھی ایک شان استغنار و اولو العزمی و حیار کی پیدا ہوگی جسکا اثر لوگوں پر بہت اچھا ہوگا ۔ اور ہر چند کہ پہلے بزرگوں نے طلبہ کے لئے اسکو گوارا رکھا ہے لیکن اُس وقت کے عوام دُنیا دار اہل علم کو ذلیل نہ سمجھتے تھے پس اُس میں یہ مفسدہ نہ تھا بلکہ وہ لوگ اِن حضرات طلبہ کے آنے کو اپنے گھر کے لیے موجب برکت سمجھتے تھے اور خود طلبہ کے کبر کا معالجہ بھی اسمیں تھا اس میں کچھ مضائقہ نہ تھا اور اب عوام کے حالات وخیالات اکثر بدل گئے اس لئے یہ مفسدہ حادث ہوگیا اور قاعدہ شرعیہ ہے کہ جس امر

میں مفسدہ و مصلحت دونوں ہوں وہ واجب الترک ہوتا ہے۔ رہا علاج کبر کا تو وہ دوسرے طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر کوئی ایسا مقام ہو جہاں یہ مفسدہ تحقیر کا نہ ہو وہ اس منع سے مستثنیٰ ہے۔ اور اسی کی ایک فرع ہے طلبہ کو فراہمی چندہ کیلئے سفر کرانا اس کے بھی وہی آثار ہیں جو کھانا لینے کے لئے گھروں پر جانے کے ہیں و الاستثناء الاستثناء۔

۶ - بعض مدارس میں طلبہ کے اعمال و امناع پر اصلا روک ٹوک نہیں ہے اس سے جو برا اثر عوام پر اور خود ان طلبہ پر واقع ہوتا ہے محتاج بیان نہیں۔

۷ - بعض مدارس میں ایسے لوگوں کو سند فراغ دیدیجاتی ہے یا دستار بندی کردی جاتی ہے جو باعتبار کمال علمی یا صلاح عملی کے اسکے اہل نہیں ہوتے جب ان لوگوں کی علمی یا عملی کوتاہی دوسروں پر ظاہر ہوتی ہے تو دوسرے علماء کو ان پر قیاس کرکے سب سے بدظنی پیدا ہو جاتی ہے اور جب علماء سے بدظنی ہو گئی تو دین کے باب میں کس سے رجوع کریں گے کس کے قول پر عمل کریں گے۔ پھر دین کا کیا حشر ہوگا تو سبب ان مفاسد کے یہ بے احتیاط لوگ ہوئے جو نااہلوں کو قوم کے سامنے معتمد اظہار کرتے ہیں۔

۸ - اکثر مدارس میں طلبہ کی تقریر و تحریر کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ اسمیں اہل علم کو عاجز ہونا انکی منصبی خدمات کا ضعیف ہوتا ہے اس لئے اس کا خاص انتظام و اہتمام ضروری ہے۔

۹ - اکثر مدارس میں طلبہ کی رائے پر تعلیم ہوتی ہے جس سے انکی استعداد تر تاسر برباد ہو جاتی ہے اسی حالت میں برائے نام تکمیل ہو جاتی ہے اور کسی کام کے لائق ہوتے نہیں۔ پس اس سے بھی وہی مفاسد مذکورہ نمبر ۷ حادث ہوتے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ ان کو پابند قواعد کا بنایا جائے خواہ طالب علموں کی تعداد

کم ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کام کے دو چار ناکارہ سو دو سو سے بھی افضل ہیں۔

۱۰۔ اکثر مدارس میں تجوید کا علم و عمل داخل نصاب نہیں۔ اسی طرح اخلاق کی کوئی کتاب درس میں نہیں۔ اول کی کمی کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر طلبہ بلکہ علماء بھی افسوس ہے کہ قرآن مجید اچھا نہیں پڑھتے جس پر عوام بھی جانتے ہیں کتنا بڑا ظلم ہے کہ عالم ہو اور نماز بروے فقہ درست نہ ہو۔ دوسری کی کمی کی مضرتیں اسقدر کثیر ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا جن کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء کی اس فن سے بے خبری کی بدولت جھوٹے مکار پیر بن گئے۔ اور وہ خلقت کی دنیا و دین کو ذبح کر رہے ہیں۔ طلبہ پر لازم کیا جاوے کہ تجوید علماً و عملاً حاصل کریں اور کتب اخلاق کو درس میں داخل کریں اور بعد فراغ التزاماً طلبہ محققین اہل اللہ کی خدمت میں حسب گنجائش قیام کریں اور ان سے آداب و اخلاق سیکھیں اور ان کی صحبت سے برکت حاصل کریں اور چندے انکی خدمت میں آمد و رفت رکھیں جس سے کہ نسبتِ باطنہ ایک گونہ راسخ ہو جائے پھر خلق اللہ کے ارشاد کو اپنے ہاتھ میں لیں انشاء اللہ تعالیٰ عموماً عوام اہل اسلام انسے وابستہ ہو کر جھوٹوں کو چھوڑ دیں گے اور مضمون قل جاء الحق وما یبدئ الباطل وما یعید آنکھوں سے نظر آجاویگا۔

۱۱۔ بعض مدارس میں یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ سب مدارس اسلامیہ کی غرض متحد ہے یعنی خدمت علوم دینیہ مگر پھر بھی ان میں سے بعض میں باہم تزاحم و تصادم ہوتا ہے کہیں علانیہ کہ ہر مدرسہ کی طرف سے دوسرے مدرسہ کے خلاف تحریراً و تقریراً سعی ہوتی ہے۔ اشتہارات میں دوسرے کو گھٹایا جاتا ہے۔ اہل چندہ کو دوسری جگہ کی اعانت سے منع کیا جاتا ہے اور کہیں خفیہ طور پر کہ عوام کو تو

اطلاع نہ ہو مگر کارکن لوگ اور دوسرے اہل فہم بھی سمجھ جاتے ہیں پھر شدہ شدہ عوام پر بھی اسکا ظہور ہو جاتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام یہ گمان کرتے ہیں کہ بس یہ مدارس اسی غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے مال و جاہ حاصل کریں ورنہ اگر محض دین مقصود ہوتا تو دوسرے کو دینی خدمت کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اپنے اوپر سے بار ہلکا ہوتا ہے برخلاف اس کے جب دنیا مقصود ہوگی تو دوسرے کا وجود اسمیں مخل ہوگا اور اس لئے تنافس و تحاسد اس کے لئے لازم ہے پھر یہ تزاحم یہاں تک ترقی کرتا ہے کہ اہل چندہ سے تجاوز ہو کر طالب علموں تک کو ہر مدرسہ اپنی اپنی طرف کھینچتا ہے۔ حتی کہ اس کشاکشی میں بعض اوقات طالب علموں کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اس تزاحم کا یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ دوسرے مدرسہ میں چندہ کا زیادہ آنا اس طرف اہل اعانت کا زیادہ راغب ہونا وہاں کا جاہ و قبول وہاں کام زیادہ ہونا یہ سب ناگوار ہوتا ہے اور اس امر کے اظہار کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مدرسہ میں وہ سب خوبیاں ظاہر و ثابت کریں گو واقع میں نہ ہوں اور گو ثابت بھی نہ ہو سکے۔ سو یہ سب دلیل ہے عدم خلوص اور عدم للہیت کی۔

ان سب مفاسد کی اصلاح ضروری ہے۔ چنانچہ کانپور میں کئی سال رہ کر مجھکو اسکا خوب تجربہ ہوا۔ تنبیہ۔ بعض مدارس میں جتنے مفاسد اوپر لکھے گئے ہیں انسے ان مدارس کو بیکار نہ سمجھا جاوے اس حالت میں بھی ان سے جو کچھ نفع دین کا ہے اس کے اعتبار سے انکا وجود نہایت غنیمت و ضروری اس حال میں سب مسلمانوں پر ان کی خدمت واجب ہے۔ البتہ اصلاح میں حتی الوسع سعی بھی کریں۔

۱۴۔ ایک عادت بعض مدرسین کی یہ ہے کہ کوئی مقام کتاب کا شرح صدر کے ساتھ

حل نہ ہو مگر ہرگز طالب علم کے سامنے اس کو ظاہر نہ کریں گے۔ اُلٹی سیدھی توجیہ گھڑ کر کچھ نہ کچھ ہانکتے رہیں گے۔ اسی طرح اگر بعض اوقات غلط تقریر ہو جاتی ہے اور اتفاق سے کسی طالب علم کا ذہن صحیح مدلول تک پہونچ جاتا ہے تو اس کی تقریر کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ اپنی ہی سخن پروری کرتے رہیں گے یا کسی مقام پر مصنف سے کچھ تسامح ہو جاوے تب بھی اُس کو خواہ مخواہ بناتے رہیں گے اسمیں علاوہ گناہ کے ایک خرابی یہ ہے کہ طالب علم کے اندر قبول حق اور انصاف کا مادہ کبھی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی مثل اپنے استاد کے مُصر علی الباطل وسخن پرور ہوتا ہے اور اس سخن پروری کے اثر سے شدہ شدہ فہم میں بھی کجی پیدا ہو جاتی ہے اور سبب اس کا محض کبر ہے کہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میری سُبکی ہوگی۔ حالانکہ اول تو یہی غلط ہے۔ قبول حق سے ہمیشہ مدح کی جاتی ہے اور آبرو بڑھتی ہے۔ پھر اگر ایسا بھی ہوا تو اصرار علی الباطل کے مفاسد دُنیویہ واُخرویہ کے مقابلہ میں تھوڑی سی سبکی بہت سہل ہے اور بھی بعض ضروری اصلاحات ہیں جن کو میرے مشفق مولوی عبداللہ صاحب گنگوہی نے اپنی ایک تحریر مسمیٰ بہ ناصح الطلبہ میں بیان کیا ہے جو کہ اس رسالے کے اخیر میں ملحق ہے اس کو بھی ضرور ملاحظہ فرمایا جائے۔

فصل چوتھی واعظین ومصنفین ومفتیین کی اصلاحات میں۔ چونکہ مثل درس کے جس کا ذکر اوپر ہوا وعظ وتصنیف وافتاء بھی منجملہ وظائف اہل علم کے ہے اس لئے اس کے متعلق اصلاحات بھی علی الترتیب قابل ذکر ہیں۔

اصلاحات متعلق وعظ۔ ایک کوتاہی تو وعظ نہ کہنے کی ہے کہ اکثر اہل علم کو دیکھا ہے کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہیں بلکہ اُس سے نفور اور اُس کی تحقیر کرنے والے

ہیں اور اس سے عار کرتے ہیں۔ اور وعظ کہنے کو خلاف شان علم سمجھتے ہیں اور یہ خطاء عظیم ہے۔ اصل طریقہ تعلیم دین کا جس کے واسطے حضرت انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے یہی وعظ و ارشاد ہے جس کے ذریعہ سے تبلیغ دین فرماتے تھے۔ باقی درس و تالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہے کیونکہ سلف میں بوجہ اہتمام حفظ و تدین صرف زبانی روایت و خطبات عامہ پر قناعت اور وثوق کیا جاتا تھا بعد میں حفظ علوم کے لئے درس و تالیف کی ضرورت ہوئی پھر اس حفظ سے ظاہر ہے کہ مقصود وہی تبلیغ و خطاب زبانی ہے جسکی قسم عام کو وعظ کہا جاتا ہے پس مقصود بالذات اس تمام تر اشتغال بالدرس و التالیف سے وعظ ہی ٹھیرا پس مقصود بالذات کی اہانت کتنی بڑی خطا ہے۔ بقیہ جو کوتاہیاں وعظ کہنے کے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:۔

نمبر ۱۔ وعظ کہہ کر نذرانہ لینا یا پہلے سے ٹھیرا لینا جس کا ایک اثر یہ ہے کہ اس وعظ کا کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ دوسرا اثر یہ ہے کہ واعظ اظہار حق سے بخوف فوت مال رکتا ہے اور تنخواہ لے کر وعظ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے اور اسی باب کی دوسری فصل میں اسکا کچھ مبسوط بیان ہوا ہے۔

نمبر ۲۔ وعظ میں غیر ضروری یا مضر عوام مضامین مثل حقائق تصوف و مسائل غریبہ بیان کرنا۔

نمبر ۳۔ منطق تقریر وعظ میں کرنا۔

نمبر ۴۔ کسی خاص شخص پر وعظ میں تعریض کرنا جس سے فتنہ کا باب مفتوح ہوتا ہے۔

نمبر ۵۔ وعظ میں کسی کی فرمائش کے تابع بن جانا و نحو ذلک

اصلاحات متعلقہ تصنیف۔ اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ (۱) غیر مفید

فنون میں تصنیف کرنا (۲) رد و قدح و مجادلہ کو اپنی تصنیف کا مطمح مقصود بنا لینا (۳) ایسے مباحث لکھنا جن کی ضرورت عوام کو نہ ہو یا ان کے مشوش کرنے والے ہوں مثل نازک مسائل تصوف یا کلام کے اور اگر خواص کو نفع پہونچانیکی ایسی ہی ضرورت ہو تو خاص زبان میں مثلاً عربی میں لکھے کہ عوام الناس کی نظر تک نہ پہونچے (۴) تصنیف کر کے حق تصنیف بیع کرنا (۵) محض تجارت کے لئے عوام کے مذاق پسند تصنیف کر کے اُس سے روپیہ حاصل کرنا

اصلاحات متعلقہ افتاء۔ اس میں یہ کوتاہیاں ہیں۔ (۱) استفتاء رکھ لینا اور جیتبل جواب نہ دینا (۲) محض تحصیل زر کے لئے افتاء کو آڑ بنا کر اُس پر فیس وغیرہ مقرر کرنا البتہ اگر سچ مچ اُسکی تکمیل و انتظام میں کچھ خرچ ہوتا ہو تو بقدر اس کے پورا کرنے کے کوئی مناسب مقدار اہل استطاعت پر بطور فیس کے لگا دینے کا مضائقہ نہیں۔ (۳) ہر سوال کے جواب کی کوشش کرنا اگر نہ بھی معلوم ہو تو یہ نہ کہنا کہ میں نہیں جانتا بلکہ کھینچ تان کر کچھ لکھ دینا اسی طرح معلوم ہونے پر بھی ہر سائل کو سوال کا جواب دیدینا اسکا اثر بھی عوام میں بہت مذموم ہوتا ہے پھر سائلین علماء کو اپنا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سوال فی نفسہ غیر ضروری ہو یا اُس سائل کے اعتبار سے غیر ضروری ہو صاف کہہ دیا جائے کہ یہ سوال غیر ضروری ہے۔ یا سائل دلیل دریافت کرے اور لیاقت دلیل سمجھنے کی نہ رکھتا ہو مجیب کو صاف جواب دیدینا چاہیے۔ اُس کے سمجھانے کی کوشش نہ کرے۔ جب دلیل انکے ذکر کرنے میں اسقدر تنگی کا مشورہ دیتا ہوں تو علت یعنی دلیل لم دریافت کرنے کی تو کبھی عوام کو گنجائش ہی نہ دے کہ اسکا علم تو خود علماء کو بھی پورا پورا نہیں الا ماشاء اللہ۔ مثلاً نماز پانچ وقت فرض ہوئی

دلیل انی تو ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور دلیل لمی اس کی وہ حکمتیں ہیں جن کی بناء پر نماز فرض کی گئی جسکو آج کل کی عام اصطلاح میں فلاسفی کہتے ہیں اور جب مطلق دلیل بتلانے میں بھی سائل کی فرمائش کا پورا کرنا نامناسب ہے تو دلیل میں تخصیص کا اتباع تو اور بھی زیادہ نامناسب ہوگا مثلاً بعضے فرمائش کیا کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسکا ثبوت لاؤ اب مجیب صاحب ہیں کہ قرآن میں تلاش کرنے کے لئے پریشان ہیں۔ دوسروں سے مدد لیتے پھرتے ہیں۔ مجکو ان حضرات کے تکلف سے تعجب ہوتا ہے حکم شرعی کے لئے مطلق دلیل شرعی کافی ہے دلیل خاص کی حاجت نہیں۔ اور ادلۂ شرعیہ چار ہیں۔ کتاب وسنت واجماع وقیاس مجتہد۔ ان میں سے اگر ایک دلیل سے بھی حکم ثابت کر دیا جائے وہ ثابت ہو جاویگا۔ البتہ حسب تفاوت ادلّہ کے خود ان احکام کے ثبوت کا درجہ بھی متفاوت ہوگا۔ (۴) بعضے مستفتی حیلے پوچھا کرتے ہیں ہرگز نہ بتلانا چاہیئے۔ (۵) بعض اوقات سوال مہمل ہوتا ہے اور وہ محتمل دو صورتوں کو ہوتا ہے اور ہر صورت کا حکم جدا ہوتا ہے۔ وہاں اکثر اہل علم تشقیق سے جواب دیدیتے ہیں کہ اگر یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے اور اگر وہ صورت ہے تو وہ حکم ہے اسکو تجربہ کاروں نے منع فرمایا ہے کہ اس سے ناخدا ترس لوگوں کو اپنی مرضی کے موافق سوال تراش لینے کی گنجائش ملتی ہے کہ وہ اسی شق کے مدعی بنجاتے ہیں اور اصل واقعہ ملتبس ہو جاتا ہے۔ اسکے متعلق بندہ نے کسیقدر پرچۂ القاسم نمبر ۸ جلد نمبر ۸ میں بھی لکھا ہے ملاحظہ فرمالیا جائے۔

پانچویں فصل

بعض متفرق اصلاحات میں۔ مثلاً اہل علم کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنے کو خوب بناؤ سنگار سے رکھتے ہیں۔ لباس میں بھی بہت تکلف کرتے ہیں یہ امر شان علم کے بالکل خلاف ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ یہ ضروری خدمات

علم سے بےفکر ہیں کیونکہ اس کی فکر کے ساتھ ان تکلفات کی طرف ہرگز التفات نہیں ہوتا اتنی گنجائش اور مہلت بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح کھانے اور سواری میں اسکا اہتمام یا مجلس میں صدر پر بیٹھنے کا شوق یا مجمع میں امام ہونیکا خیال یا چلنے میں تقدم کی فکر یہ سب شعبے ہیں ریا اور کبر کے اور منافی ہیں غرض علم کے۔ تواضع واجبات شرعیہ وعقلیہ سے ہے اور نافع ہے تکمیل خدمت دین میں کہ اس سے لوگوں کو اُنس اور اُنس سے اُنکو نفع دین باسانی پہنچتا ہے۔ اسی طرح بروئے حدیث البذاذۃ من الایمان سادگی ضروری ہے اس سے یہ بھی فائدہ ہے کہ مساکین کو بُعد و توحش نہیں ہوتا اور یہ لوگ دین کے زیادہ قبول کرنیوالے ہوتے ہیں۔ اسلئے اُنکو ضرور قریب رکھنا چاہیئے۔ البتہ سادگی کے ساتھ طہارت و نظافت ضروری ہے لنظفوا افنیتکم ضرورت تنظیف کو بتلا رہا ہے۔ جب افنیہ جن کو تلبس بعید ہے واجب التنظیف ہیں تو لباس جسکو تلبس قریب ہے اور بدن کہ جزء ہے کیونکر واجب التنظیف نہو گا۔ اور مثلاً دوسرے مولویوں کو بھلا برا کہنا کہ علاوہ اسکے کہ بعض احقات معصیت بھی ہوجاتی ہے عوام پر بُرا اثر ہوتا ہے وہ سب سے بدگمان ہوجاتے ہیں۔ اگر کسی صاحب باطل کے شر سے بچانا ہی ضروری ہو تو تہذیب کے ساتھ اطلاع کردینا کافی ہے اور جس طرح خود اسمیں مشغول ہونا مضر ہے اسی طرح دوسرے مشغول کے ساتھ شریک ہوجانا یعنی کسی دوسرے شکایت کرنے والے سے شکایت مولویوں کی سُن لینا بھی ایسا ہی مضر ہے بلکہ غیر مولویوں کی مذمت کرنا یا سننا بھی گو کسی حالت میں جائز بھی ہو مگر علماء کی شان کے مناسب نہیں۔ بعض دفعہ اسمیں کوئی ایسا مفسدہ پیدا ہوجاتا ہے کہ اپنے دین میں حرج ہونے لگتا ہے اور مثلاً کسی کے فیصلہ میں پڑنا گو فی نفسہ طاعت ہے لیکن حسب ارشاد نبوی کہ حضرت ابوذرؓ کو فرمایا تھا لا تقضین بین اثنین اُن علماء کو جو

حکام نہیں ہیں۔ اسمیں پڑنا مناسب نہیں کہ اسمیں بدنامی اور شبہ طرفداری کا ہوتا ہے پھر جو نفع دین مسلمانوں کے ساتھ یکساں تعلق رکھنے سے ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے۔ البتہ ایک صورت فیصلہ کی بہت اسلم یہ ہے کہ فریقین اگر درخواست کریں تو اُن سے کہے کہ تم دونوں مل کر سوال لکھ کر اپنے اپنے دستخط کر دو پھر اُسپر حکم شرعی بطور جواب لکھ کر حوالہ کرے کہ اسپر دونوں عمل کر لو یا کسی ثالث کو حکم مقرر کر کے اُس سے نافذ کرالو اور اسی مصلحت سے مناسب ہے کہ مالی معاملات سے علیحدہ رہے مثلاً چندہ وصول کرنا یا اسکا تحویلدار بننا یا اس کے صرف کا اہتمام لینا یہ سب صورتیں بدگمانی اور تہمت کی ہیں۔ ایسے کام متدین رؤسا کے متعلق ہونا چاہیئے۔ البتہ ان رؤسا کو چاہیئے کہ جو کام کریں علماء سے ... حکم شرعی دریافت کر کے کریں۔

خاتمہ

اُن باہمی تعلقات کے بیان میں جو اہل دنیا اور اہل علم میں ہونے چاہئیں مختصر اُن کا یہ ہے کہ نمبرا دنیادار علماء کو اپنا مخدوم سمجھیں نمبر۲۔ اُن کا ادب اور تعظیم کریں نمبر۳۔ وہ جو کام دین کا کر رہے ہیں جسمیں مال کی ضرورت ہو بدون اُن کی استدعا کے اسمیں

اھانت کریں۔ نمبر۴۔ جو بات اُن سے پوچھیں ادب سے پوچھیں۔ نمبر۵۔ دلائل دریافت نہ کریں نمبر۶۔ اگر کوئی شبہہ رہے۔ معاندانہ سوال نہ کریں مستفیدانہ پوچھیں نمبر۷۔ اگر اُن سے کوئی لغزش ہو جائے تو اُنکی مذمت نہ کریں۔ آخر وہ بشر ہیں اُن سے بھی خطا ہوتی ہے۔ وہ اِس حال میں بھی تمہارے نفع اور ہدایت کیلئے کافی ہیں تم اُن کے اقوال پر عمل کرو افعال کو مت دیکھو نمبر۸۔ تمہارا شبہہ ایک عالم سے حل نہو دوسرے سے حل کرو اور ایک کا قول دوسرے کے روبرو مت نقل کرو اور علماء کو چاہیئے کہ نمبر۱۔ دنیاداروں کو اپنا برابر کا بھائی سمجھیں۔ نمبر۲۔ اُن سے تعظیم و خدمت کے متوقع نہ ہوں۔ نمبر۳۔ اگر بلاتوقع کچھ کردیں تو یوں سمجھیں کہ علم اور دین کی خدمت تو ہمارے ذمہ تھی انھوں نے احسان کیا کہ ہماری اعانت کی انھیں قیل و قال نہ کریں۔ جیسے بعض کی عادت ہے کہ کہیں تقرر تنخواہ پر تکرار ہے کہیں ترقی تنخواہ کا تقاضہ ہے کہیں نذرانہ پر کشاکش نمبر۴۔ اگر اُن سے کچھ بے تمیزی ہو جاوے صبر کریں۔ بدمزاجی نہ کریں۔ یہ سمجھ لیں کہ جب اُن کو ہمارے برابر علم نہیں تو ہمارے برابر تمیز کیسے ہوگی۔ نمبر۵۔ اگر کسیکو قولاً یا فعلاً حد شرع سے متجاوز دیکھیں جب پر حکومت اور قدرت نہ ہو تشدد نہ کریں۔

نرمی اور دلجوئی سے بہت اصلاح ہوتی ہے۔ نمبر ۶۔ اگر عامی کوئی حق بات کہے قبول کرنے سے عار نہ کریں۔ نمبر ۷۔ اگر کسی مسئلہ میں اپنی غلطی ظاہر ہو اعلان کردیں۔

اب اس رسالہ کو ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ رسالہ باوجود اختصار کے ضروریات متعلقہ علوم دینیہ کے جامع اور علماء و عوام دونوں کے لئے نافع ہے وان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ ختم ہوا آغاز رجب ۱۳۳۲ھ

انفاس عیسیٰ ہر دو حصہ: حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی خلیفہ خاص حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کو اپنے شیخ کے مواعظ و ملفوظات کے مضامین کے انتخاب کا خاص سلیقہ تھا جس سے کم فرصت اصحاب کو تھوڑے وقت میں بہت زیادہ دینی معلومات ہو جاتی ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی کتابیں تعلیمات اشرفیہ و انفاس عیسیٰ نظیر نہیں رکھتیں جن کو بہت مقبولیت ہوئی اور شائع ہو کر عرصہ سے نایاب تھیں۔ کمالات اشرفیہ تو دوبارہ طبع ہو کر اپنے ہی ادارہ سے شائع ہوئی لیکن انفاس عیسیٰ کے ہر دو حصے عرصہ سے نایاب تھے الحمد للہ کہ دوبارہ طبع ہو گیا ہے قیمت ہر دو حصہ مجلد ۲۵ روپے

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم فحیث وجدھا
احق بہا (الحدیث)

الحمد للہ کہ رسالہ عجالہ

ناصح الطلبہ

از افاضات استاذ العلماء حضرت مولانا
مولوی محمد عبد اللہ صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

باہتمام احقر ظہور الحسن غفرلہ ناظم
مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون زیور طبع پوشید
(محبوب پریس دیوبند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ناصح الطلبہ

جسکا ذکر حقوق العلم کے باب دوم کی فصل سوم میں ہوا

بعد خیر القرون کے جو انقلابات امتہ مرحومہ میں ہوئے انکی تفاصیل کا احاطہ تو معتذر ہے اور بقدر ضرورت اسکو مع اسکی اصلاح کے حکیم الامتہ جامع شریعت و طریقت حضرت اقدس مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب مدظلہم تحریر فرما رہے ہیں جو رسالہ الکلام میں ناظرین مطالعہ فرماتے ہیں منجملہ انکے ایک انقلاب طلبہ میں ہوا جو اکثر انقلابات کا مبداء و منشاء ہے وہ یہ کہ زمانہ حال کے طلبہ میں دو طرح کی خرابی ہیں ۔ ایک تو طلب کی حیثیت سے دوسری اخلاقی جہت سے۔ اس زمانہ کے طلبہ کو پیش نظر رکھ کر تدریجاً اساتذہ اور اساتذہ کے اساتذہ وہلم جرا حضرات متاخرین و متقدمین علماء پر نظر ڈالیے تو ان طلبہ اور ان حضرات میں طلب کی حیثیت سے بعد المشرقین

کھلی آنکھوں مشاہد ہوگا۔ اُن حضرات میں طلب کی یہ شان تھی کہ ایک ایک حدیث کیلئے کوسوں منزلوں سفر فرماتے تھے اور ایک ایک راوی کی تحقیق میں بے حد و عد مشاق و متاعب برداشت فرماتے۔ اور باوجود اس مشقت کے اگر مطلوب تک وصول نہ ہوتا تھا تو طلب کو نہ چھوڑتے تھے اور ایک ایک مسئلہ کی تدقیق میں راتیں گذار دیتے تھے اور ایک ایک سطر کے حل کرنے کے لئے دماغ کھپا دیتے تھے۔ انکی اس بیحد جانکاہی اور طلب صادق کی حکایات سے دفتر کے دفتر مملو ہیں اور پھر حالت یہ تھی کہ نہ کتاب میسر ہوتی تھی اور نہ تیل بتی کے لئے پیسہ پاس تھا نہ کوئی طعام و لباس کا متکفل تھا فاقوں مرتے تھے اور علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ میں نے ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے یہاں بائیس۲۲ آدمی بخاری شریف میں شریک تھے۔ اور صرف ایک نسخہ بخاری کا تھا سب نقل کرکے پڑھتے تھے۔ غرض گوہر علم کے لئے بحر طلب میں ایسی غواصی کرتے تھے کہ اگر اُنکی حکایات آج کل کے طلبہ کے سامنے بیان کی جاویں تو یقین آنا تو کیا معنی شاید اُنکے محال ہونیکا دعویٰ کریں تو عجب نہیں پھر اُن کو اس طلب صادق کا ثمرہ جو کچھ ملا وہ سب اسوقت دیکھ رہے ہیں کہ کوئی فن ایسا نہیں رہا جسمیں اُن حضرات کا قدم صدق نہ ہو۔ تفسیر حدیث فقہ اصول فقہ معانی بیان

تصوف وصرف ونحو ہر فن کو اپنی انتہا تک بلکہ آگے تک پہونچا دیا۔ ہم کو تو مفت کی دولت مل گئی۔ سچ یہ ہے کہ اگر وہ ایسی مشقت کرکے علوم وفنون کو مدون نہ فرماتے تو اس وقت جہل کی ظلمت سے عالم تاریک نظر آتا۔

ایک اسوقت ہم لوگ ہیں کہ ہمارے سامنے تحصیل علم کے سب سامان موجود ہیں اساتذہ شفیق کتابیں صاف خوشخط مزین محشی دو وقتہ کھانا پکا پکایا طیار، رہنے کے لئے ایسے کمرے کہ بعضے رئیسوں کو بھی میسر نہیں۔ غرض تمام اسباب تحصیل علم کے مہیا اور حالت ہماری یہ ہے کہ نہ کتاب کی طرف توجہ ہے نہ اساتذہ سے اُنس ہے نہ شوق ہے نہ طلب ہے۔ نہ مطالعہ ہے نہ تکرار ہے۔ نہ وہ رنگ علمی ہے۔ کتابیں ختم کرلیں گے۔ دستارِ فضیلت زیب سر ہوجائیگی لیکن استعداد کی یہ حالت ہے کہ املا تک صحیح نہیں۔ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے ینقض اور ینقذ میں فرق نہیں کرسکتے (الا ماشاء اللہ) پھر ہمارے اس بد استعدادی اور ناقابلیت کے جو ثمرات ہیں وہ مشاہد ہیں کہ ایسے ایسے افراد جب ہمارے مدارس سے فارغ ہوکر نکلتے ہیں تو اُن کو لیاقت واستعداد تو ہوتی نہیں۔ تدریس کی قوت نہیں۔ افتاء کا سلیقہ نہیں۔ یا تو وعظ گوئی کو اپنا پیشہ بناتے ہیں اور

اس میں بھی غلطیاں کرتے ہیں یا کسی مسجد میں امام بنتے ہیں اور اگر تدریس کے لئے بھیج دئے گئے تو وہاں بے آبروئی ہوتی ہے۔ ایسے ایسے نتائج کو دیکھ کر عام لوگ کم عقل سمجھتے ہیں کہ علم دین پڑھنے کا نتیجہ بس یہی ہے کہ یا تو وعظ کہہ کر پیٹ پالو یا کسی مسجد کی امامت سنبھالو۔ اسلئے پختہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کو علم دین نہ پڑھاوینگے۔ اور اپنی ناحقیقت شناسی سے یہ نہیں جانتے کہ یہ علم کا نتیجہ نہیں ہے یہ طلبہ کی کم ہمتی کا ثمرہ ہے۔

اب میں اپنی عنان تقریر کا ان عوام کی طرف رُخ کرکے عرض کرتا ہوں کہ ہم نے مان لیا کہ اسوقت علم کا یہی نتیجہ ہے لیکن بہت زور سے للکار کر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ علم دین کی ہر طرف ہر حالت میں خواہ اُس میں مشغول ہونے سے استعداد اور کمال حاصل ہو یا نہ ہو مائل ہوتا اور برائے نام بھی اُسکی طلب ہونا بلکہ دائرے کو وسیع کرکے کہا جاتا ہے کہ مدارس اسلامیہ میں بیکار رہکر رہنا لاکھوں کروڑوں درجے انگریزی میں مشغول ہونے سے بہتر ہے۔ اسلئے کہ گو لیاقت اور کمال نہ ہو لیکن کم از کم عقائد تو فاسد نہ ہونگے۔ اہل علم سے محبت تو ہوگی اگرچہ کسی مسجد کی جاروب کشی ہی میسر ہو۔ یہ جاروب کشی اُس انگریزی میں کمال حاصل کرنے اور وکیل و بیرسٹر وغیرہ بننے سے

کہ جس سے اپنے عقائد فاسد ہوں اور ایمان میں تزلزل ہو اور اللہ و رسول و صحابہؓ و بزرگان دین کی شان میں بے ادبی ہو کہ جو اس زمانہ میں انگریزی کا اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے اور یہ ترجیح محب دین کے نزدیک تو بالکل واضح ۔ ہاں جسکو دین کے جانیکا غم ہی نہ ہو وہ جو چاہے کہے لیکن بایں ہمہ اس فساد استعداد کی اصلاح کی ضرورت ہے اسلئے کہ اسکے نتائج اچھے نہیں ۔ اور اگر اسکی اصلاح ہو گئی تو ایک عالم کی اصلاح ہو جائیگی ۔ اور پھر جسقدر علماء مدارس سے فارغ ہو کر نکلیں گے وہ دین کے سچے خادم ہونگے اور دین کی خدمت کر کے دکھلائینگے ۔ اسلئے حضرات علماء کی بخصوص جو حضرات شغل تدریس میں مشغول ہیں انکی خدمات عالیہ میں عرض ہے کہ حضرات درحقیقت آپ اس وقت بڑا کام کر رہے ہیں اور جس طریق سے آپ درس دے رہے ہیں فی الواقع طریق یہی ہے اور اسی طریق تدریس سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے اور اب بھی اگرچہ قلیل ہی سہی مستعد پیدا ہوتے ہیں لیکن اس زمانہ میں بوجہ کم توجہی طلبہ اور قوۃ فہم کے ضعیف ہو جانے کے یہ طریق تدریس کا کافی نہیں ہے ۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ طریقہ تدریس میں ایسی ترمیم کی جائے جس سے طلبہ کو استعداد ہو اور یقین ہے کہ آپ حضرات اس ضرورت کو محسوس کر رہے

ہونگے اور اس طریق کا تجویز کرنا یہ آپ ہی حضرات کا کام ہے۔
لیکن بغوائے رب رمیۃ من غیر رام وبمصداق ؎

گاہ باشد کہ کودکے ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے

یہ ناکارہ بھی کچھ عرض کرتا ہے شاید وہ صحیح ہو۔ وہ یہ ہے کہ اس بد استعدادی کے چند اسباب ہیں طلبا کی کم توجہی یہ تو مشترک اور عام ہے اور فہیم اور ہونہار بچوں کا انگریزی میں مشغول ہونا اور ضعیف الفہم طلبہ کا عربی کی طرف توجہ کرنا اور عربی کے فاضلوں کی قدر نہ ہونا۔ ان اسباب مذکورہ کے علاوہ ایک اور سبب ہے اور اُس کا تدارک مدرسین کے اختیار میں ہے اور اس کے بیان کرنے کیلئے یہ سطریں لکھی گئی ہیں۔ وہ بعنوان مختصر یہ ہے کہ طلبہ کی استعداد سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔
تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اب تک تدریس کا طریق یہ ہے کہ طالب علم اول عبارت پڑھتا ہے اس کے بعد مدرس اس مقام کی شرح مع اسکے ماله وما علیہ وما فیہ کے بیان کرتا ہے۔ اس درمیان میں اگر کسی کو شبہ ہو وہ دریافت کرلیتا ہے۔ مدرس جواب دیتا ہے بس مدرسین اسکا تعہد نہیں فرماتے ہیں کہ طلبہ اس مقام کو سمجھ جاویں بعض کا مقصود تو مدرسہ کا وقت پورا کرنا ہوتا ہے اور بعض اپنی تقریر صاف کرنے کے لئے تقریر فرماتے

ہیں اور بعض اپنی اظہار لیاقت کیلئے صعوبت برداشت کرتے ہیں اور یہ خیال نہیں فرماتے ہیں کہ ہم نے جو اتنی دیر تک تقریر کی طلبہ کو اس سے کیا آیا ہے یا نہیں الّا ما شاء اللہ۔ اور یہی طریق ابتدائی کتب سے لیکر انتہا تک جاری رہتا ہے۔ سو میرے نزدیک یہ طریق اسوقت مبتدیوں بلکہ متوسطین کیلئے بھی بالکل غیر نافع ہے البتہ یہ اُن طلبہ کیلئے نافع ہے جو منتہی ہو کر فاضلانہ استعداد حاصل کر چکے ہیں اور بڑے حضرات کے یہاں مستفید ہو رہے ہیں۔ اور مبتدیوں کیلئے تو نہایت ہی مضر ہے۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائیگا اُس قوت کو کبھی ترقی نہ ہو گی۔ دیکھیے جس انجن یا جس مشین سے کام نہ لیا جائے وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی قویٰ کا حال ہے کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائیگا وہ رفتہ رفتہ سُست اور ضعیف ہو کر کالعدم ہو جائیگی وہذا ظاہرٌ جداً۔

اسی طرح قوت فہم کا حال ہے کہ جب اس سے کوئی کام لینے والا ہو گا تو اُسکو قوت ہو گی اور کتب درسیہ پڑھنے کی غایت بھی یہی ہے کہ ملکۂ راسخہ اور استعداد کتب بینی و کتب فہمی کی حاصل ہو جائے۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ تقاریر یاد ہو جائیں اساتذہ کی بتائی ہوئی تمام تقریریں نہ کسی کو یاد ہوئی ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ پڑھتے پڑھتے ملکہ پیدا ہو جاتا ہے

اور اسی سے کام لیا جاتا ہے بلکہ ملکۂ کافیہ کے پیدا ہو جانے کے بعد پھر تعلیم کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ چونکہ طلبہ آجکل خود کم توجہ ہیں اپنے طبائع پر زور نہیں ڈالتے اور نہ اساتذہ کی طرف سے اسکی تاکید ہوتی ہے اسلئے اُن کی قوت فہم معطل ہو کر کمزور ہو جاتی ہے۔ اور استعداد جس مرکز پر ہوتی ہے وہاں ہی ٹھہر جاتی ہے گو برائے نام کتابیں بھی ختم ہو جائیں۔ اسلئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس طریق تدریس میں کچھ ترمیم کی جائے اور وہ یہ ہے کہ طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے خود اُن کو بلا ضرورت شدید امداد نہ دیجائے۔ جو مقام ایسا ہو کہ ان کی استعداد سے باہر ہو اسکی تقریر تو خود کر دی جایا کرے ورنہ خود اُن سے ہی تقریر کرائی جاوے اور نیز ہر قاعدہ اور مسئلہ کے متعلق کثرت سے امثلۂ مشقیہ دریافت کی جاویں تاکہ وہ قاعدہ خوب جاری ہو جائے اور یہ طریق گو تمام درس میں مفید ہے لیکن ابتدائی کتب میں تو بہت ہی ضروری ہے اسلئے کہ مبتدیوں کی حالت نہایت ردی دیکھی جاتی ہے اور جب ابتداء درست ہو جاتی ہے تو پھر اور کتب بھی سہل ہو جاتی ہیں۔

بطور تمثیل کے بعض بعض ابتدائی کتابیں اور بعض متوسط کتب کے متعلق اس طریق کو مفصلاً عرض کرتا ہوں مثلاً میزان منشعب جب شروع ہوں تو ایسا نہ کیا جاوے کہ سبق پڑھا دیا اور اس کو حفظ سُن لیا۔

اس سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ سبق پڑھا کر اور یاد کرا کر اس کے متعلق امثلہ مشقی بکثرت دریافت کی جاویں۔

نمبر ۱ مثلاً ماضی کی بحث پڑھائی تو کم از کم تین چار سو مختلف صیغے ماضی کے دریافت کئے جاویں۔ نمبر ۲۔ اور مصادر دیکر اُنسے ماضی کے صیغے بنوائے جاویں نمبر ۳۔ اور مصادر کے معنے بتا کر اُن کے ماضی کے صیغوں کی اردو دیدی جاوے کہ اُسکی عربی بنا دیں نمبر ۴۔ اگرچہ اس اجراء میں کئی روز صرف ہو جاویں بجائے سبق کے یہی کام ہونا چاہیئے نمبر ۵ اسی طرح جب دوسری بحث پڑھائی جائے اُسکے متعلق بھی یہی عملدرآمد کیا جاوے۔ جب تمام میزان اس طرح ہو جاوے تو منشعب شروع کرائی جاوے اور منشعب کے مصادر کی میزان پر گردان کرائی جاوے اور مختلف صیغے بکثرت دریافت کئے جاویں اور نیز اردو کے صیغے منشعب کے مصادر کے متعلق دئے جائیں تاکہ اُسکی عربی بنا دیں نمبر ۶۔ جب پنج گنج شروع ہو اُسمیں یہی قاعدہ جاری کیا جاوے یعنی جو تعلیل تغیر کے قواعد ہیں ہر قاعدہ کی کم از کم سَو سَو مثالیں اُن سے دریافت کی جاویں۔ نمبر ۷۔ اور مصادر دیکر اُنکی گردان مع تعلیلات لکھوائی جاوے۔ جب اس طور سے پنج گنج ختم ہو جاوے تو نحو میر شروع کرائی جاوے اور اُس کے اندر قواعد ذیل کا لحاظ رکھا جاوے۔

نمبر۱۔ جسقدر سبق ہو اور اُسمیں جو قواعد پڑھائے جاویں اُسکے متعلق چھوٹے چھوٹے جملے عربی کے دیکر اردو ترجمہ مع ترکیب کرایا جاوے اور اردو کے جملے دیکر عربی بنوائی جاوے۔ ان دونوں قسم کے جملوں کے لغات تشعب کے مصادر ہونے چاہئیں۔ نمبر۲۔ ان جملوں کو حسب استعداد متعلم تدریجی تطویل دیجائے حتیٰ کہ نحو میر کے ختم پر طویل طویل سلیس عبارتیں اردو کی دیکر عربی بنوائی جائے اور سلیس عربی کا اردو ترجمہ کرایا جائے۔ اس طور سے جب نحو میر ختم ہوگی تو شرح مأتہ عامل اور ہدایۃ النحو کی عبارت طالب علم خود صحیح پڑھیگا اور اگر کہیں غلطی کرے تو بتلایا نہ جاوے اسی سے خود قاعدہ پر جواب طلب کیا جائے۔ مثلاً طالب علم نے مرفوع کو منصوب پڑھا تو اُس سے پوچھا جائے کہ منصوب کس وجہ سے پڑھا ہے یہ منصوبات کی کونسی قسم میں داخل ہے۔ اگر منصوبات میں سے کسیکا نام بتائے مثلاً کہے مفعول بہ ہے یا مفعول فیہ ہے تو کہنا چاہیئے کہ اسکی تعریف اسپر منطبق کردو۔ جب منطبق نہ کرسکے تو کہے سوچ کیا ہے۔ اس طریق سے خود اسی سے نکلوانا چاہیئے سبق کے کم ہونے یا نہ ہونے کا ہرگز خیال نہ کریں۔ اگرچہ کسی دن بالکل نہ ہو یا ہو تو کم ہو اور ابتداً کتب میں عبارت پڑھنے کا نمبر مقرر نہ کریں بلکہ جس سے دل چاہے پڑھوائے بلکہ ابتدائی کتب میں بہتر ہے کہ ایک روز کے سبق کا تجزیہ کرکے کئی طلبہ سے پڑھوائیں چندروز تک

انشاء اللہ تعالیٰ استعداد ایسی ہوگی کہ کہیں عبارت کی غلطی نہ کرینگے اور یہ وھبہ طلبہ سے دُھل جایگا کہ اُن کو عبارت تک صحیح پڑھنا نہیں آتی۔ یہ طریقہ تو صحیح عبارت کا ہوا۔ اس طریقہ کو تمام کتب کے اندر اجراء کی ضرورت نہ ہوگی صرف ابتدائی کتابوں کے جیسے ہدایت النحو نفحۃ العرب قدوری کافیہ مرقاۃ وغیرہ پہنچنے تک ضرورت پڑیگی بلکہ نحو میر کے اندر اگر قواعد مذکورۃ الصدر کا اجراء کیا تو عبارت میں بہت کم غلطی ہوگی اور اگر ہوگی تو وہ اس طریق کے اجراء سے مرتفع ہوجائے گی۔

اب تقریر مضمون کے متعلق عرض ہے کہ مضمون کے اندر یہ غور کرنا چاہیئے کہ یہ مضمون کس قسم کا ہے۔ یہ طالب علم جو عبارت پڑھتا ہے اس مضمون کو خود سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر خود سمجھ سکتا ہے تو اس مضمون کی آپ ہرگز تقریر نہ کریں طالب علم ہی سے تقریر کرائیے۔ اگر نہ کرسکے تو جماعت میں سے دوسرے سے تقریر کرائیے اگر کوئی نہ کرسکے تو سمجھنا چاہیئے کہ مطالعہ نہیں دیکھا یا سرسری دیکھا ہے۔ اس جماعت کو اٹھادے اور ہدایت کردے کہ مطالعہ دیکھ کر پڑھو۔ دو ایک مرتبہ جب ناغہ ہوگا تو طلبہ کو خود خیال ہوگا اور مطالعہ ضرور دیکھیں گے اور جو مضمون ایسا دقیق ہے کہ طلبہ کی استعداد سے باہر ہے تو اس مضمون کو نہایت سہل عنوان سے بلا رنگینی تقریر و استعارات و حشو و زوائد کے تقریر کرکے پھر طالب علم

سے ایک مرتبہ تقریر کرائے اور جس فن کی کتاب بھی شروع ہو اُس میں تدریس کا یہی طریق جاری کرے اور امثلہ مشقی بکثرت دریافت کرنا چاہیئے۔ مثلاً فن بلاغت شروع ہو تو ہر قاعدہ کے متعلق آیات قرآن مجید اور اشعار جاہلیت دیکر قواعد بلاغت اُنمیں جاری کرائے جاویں۔ قدما کی بلیغ عبارت دیکر اُس کی فصاحت و بلاغت دریافت کرے اور اردو کی عبارت دیکر اسکی عربی مع رعایت قواعد بلاغت بنوائے۔ اسی طرح جب فقہ کی کوئی کتاب شروع ہو تو اس کتاب کے مرتبہ کے موافق چھوٹے چھوٹے مسئلے دئیے جائیں کہ بحوالہ کتب اسکا جواب لکھیں۔ علیٰ ہذا منطق کے قواعد کا اجرا اسی طرح کرایا جائے۔ غرض جو فن شروع ہو اُسکو عملی طور سے جاری کرایا جائے گو اس میں مدت زیادہ لگے لیکن تساہل نہ کیا جائے اور میرا خیال یہ ہے کہ ابتدا سے اگر یہ طریق جاری کیا جائے تو استعداد کے بڑھنے کے ساتھ دل بھی بڑھیگا اور توجہ میں زیادتی ہوگی تو مدت بھی زیادہ صرف نہ ہوگی اور اس اجرار قواعد کے لئے سبق سے علیحدہ مستقل وقت مقرر کرنا چاہیئے۔ اسکو بجائے ایک سبق کے سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اسمیں دقت یہ ہوگی کہ ہر مدرس پر یہ اطمینان نہیں ہے کہ ان قواعد کو جاری کرے اور امثلہ مشقی مجتمع ہیں نہیں اور خود اُسکو تلاش کرنے میں دقت ہوگی اسلئے حضرات جامعۃ القاسمیہ

اپنی دار العلوم کے متعلق خصوصاً مدارس کے مہتممین کو اس طرف متوجہ کریں
اور دیگر مہتممین مدارس از خود عموماً اپنی توجہ اس جانب مبذول فرمائیں کہ چندہ کر کے ایسی کتب درسیہ طبع کرادیں جنکے حواشی پر امثلہ مشق بترتیب حسن وباسلوب پاکیزہ لکھی جائیں اور ان کتب کو درس میں داخل کریں پھر خواہ مخواہ ہی مدرسین اس طریق سے پڑھانے پر مجبور ہونگے اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے اسلئے کہ دیکھا جاتا ہے کہ غیر ضروری کام ہیں انکے لئے چندے جمع کئے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ کام اس سے زیادہ ضروری نہیں۔ اسلئے کہ یہ تو خود مقصود کا سبب قریب ہے اور دیگر امور زائدہ اگر نہ بھی ہوں تو چنداں حرج نہیں ہے اور اسوقت اس طریق کی نہایت شدید ضرورت ہے۔ اگر اس طریق کا اجرا نہ کیا گیا تو بہت جلد وہ وقت دکھلائی دیتا ہے کہ علم گم ہو جائیگا۔ اور اگر یہ عذر ہو کہ طلبہ کو اس سے وحشت ہو گی اور بھاگ جاوینگے اور مدارس خالی رہ جائینگے۔ اول تو یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ طلبہ زیادہ آئینگے۔ اور دوسرے یہ کہ جب بڑے بڑے مشہور مدارس میں اسکا اجرا ہو گا تو طلبہ ہرگز نہ جائیں گے اور اس طریق سے استنکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ایسی ایسی ترمیمات تو ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔ دیکھئے سلف صالحین اور محدثین رحمۃ اللہ علیہم کا طرز یہ تھا کہ شیخ خود پڑھتے تھے اور تلامذہ سنتے

تھے اُسوقت یہی نافع ہونے میں کافی تھا اسلئے کہ وہ تلامذہ خود عالم ہوتے تھے۔ انکو اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ خود پڑھیں۔ اُس کے بعد جب استعداد میں وہ قوت نہ رہی اور یہ طریق ناکافی ہونے لگا تو علماء نے اس طرز کو بدل دیا کہ شیخ سنے اور تلامذہ میں سے ایک شخص عبارت پڑھے اور پڑھنے کیلئے وہ منتخب ہوتا تھا جو عبارت جلدی پڑھ سکتا تھا تھا۔ ایک زمانہ تک یہی طرز رہا۔ اُس کے بعد پھر نمبر مقرر کیا گیا کہ نمبروار سب پڑھیں۔ پھر نمبروار پڑھنے میں یہ شبہہ ہوا کہ جسکا نمبر ہوگا وہ مطالعہ دیکھے گا اور باقی نہ دیکھیں گے۔ اس لئے نمبر بھی بعض جگہ مقرر نہیں رہا بلکہ اُستاد جسکو کہدے وہ پڑھے اور مطلب کی تقریر بہر حالت میں اُستاد کرے۔ لیکن بوجہ ضعف استعداد و کم توجہی طلبہ یہ طریق بھی ناکافی ثابت ہوا۔ کما مر مفصلاً۔ اسلئے اب اس کی ضرورت واقع ہوئی کہ عبارت بھی طالب علم پڑھے اور مقصود کی تقریر بھی وہی کرے اور جو کچھ اُسکی تقریر میں کمی رہے اُس کو اُستاد پورا کردے یا مشکل مقام کی تقریر کردے۔ چنانچہ مفصلاً اُس کی ضرورت اوپر معلوم ہوچکی ہے اسلئے حسب اقتضاء ضرورت زمانہ اگر اس طریق کو جاری نہ کیا جاویگا۔ اور بدستور وہی طریق تدریس رہیگا تو علوم کے گم ہوجانے کا صرف احتمال ہی نہیں بلکہ قریب یقین کے ہے۔

اے حضرات علماء و مدرسین آپ حضرات کی بلیغ توجہ کی سخت ضرورت ہے اس لئے آپ اس طرف توجہ فرماویں اور میرے ان بے سروپا جملوں میں غور فرماویں۔ یہ ناکارہ بوجہ علمی بداستعدادی کے تحریراً یا تقریراً اپنے پورے مافی الضمیر ادا کرنے سے قاصر ہے لیکن اگر آپ ذرا غور فرماویں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی سمجھ میں آجاوے گا کہ فی الواقع اسکی سخت ضرورت ہے۔ یہ تمام تر تقریر تو استعداد کے متعلق تھی اب اخلاقی حیثیت سے جو تغیر طلبہ میں ہوا ہے وہ معروض ہے۔ وہ یہ ہے کہ اخلاق کے اعتبار سے تغیرات تو بہت ہوگئے ہیں لیکن صرف دو امر کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جن کے تدارک کی نہایت ہی ضرورت ہے۔

اوّل اُن میں سے بے ریش لڑکوں کا فتنہ ہے جو مدارس میں بلائے عام کی طرح شائع ہے اسکے تدارک کی سخت ضرورت ہے اور اس کے بُرے نتائج محتاج بیان نہیں ہیں۔ اس کے لئے مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ دس دس یا بیس بیس لڑکوں کے لئے ایک معمر متقی تنخواہ دار نگراں مقرر کیا جاوے اور مندرجہ ذیل اُمور اسکے متعلق ہونا چاہئیں:— **نمبر ۱**۔ اُن کو کسی بڑے طالب سے نہ ملنے دے **نمبر ۲**۔ نگراں سے الگ ہوکر آپس میں بھی وہ ایک دوسرے سے باتیں نہ کریں۔ **نمبر ۳**۔ اُن کے اندرونی حالات کی بخوبی نگرانی کرے **نمبر ۴**۔ اُنکے نام جو

خطوط آویں وہ بھی دیکھ کر دے۔ **نمبر ۵**۔ اُن کے سر منڈا تا رہے۔ **نمبر ۶**۔ پان کھانے سے روکے۔ **نمبر ۷**۔ ان کا لباس سادہ ہو اگرچہ اُمراء کے بچوں کا قیمتی ہو **نمبر ۸**۔ نماز و جماعت میں اُنکی حاضری کی نگرانی رکھے **نمبر ۹**۔ اگر کہیں تفریح کیلئے یا کسی ضرورت کیلئے بازار وغیرہ جائیں تو خود اُن کے ساتھ رہے۔ **نمبر ۱۰**۔ اگر ان اُمور کے خلاف کریں تو مناسب سزا دے وغیر ذلک۔

دوسرا تغیر نہایت قابل حسرت و افسوس ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں نیچریت اور نئی روشنی کے اثر کی ایسی کثرت ہوئی جیسے آب و ہوا کے فساد سے ہیضہ اور طاعون کی اور اس اثر سے بہت کم نفوس محفوظ رہے ہیں۔ اگرچہ اس اثر سے چند روز قبل عام لوگوں کے متاثر ہونے کا صدمہ تھا لیکن اب تک طلبہ و علماء اس سے بحمد اللہ محفوظ تھے اور اب بھی بہت بحمد اللہ محفوظ ہیں لیکن اب چند روز سے بعض طلبہ میں یہ اثر معتد بہ درجے میں آگیا ہے اسکا نہایت درجے قلق ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خدا نخواستہ اُنکے عقاید بھی ان لوگوں کے عقاید جیسے ہو گئے توبہ توبہ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ وہ جو ایک سادہ رنگ خلوص کا طلبہ سابقین میں تھا جس سے اُنکو دیکھ کر اُنکی طرف دل کو بے انتہا کشش ہوتی تھی اور اگر کبھی عوام دنیاداروں کی جماعت میں کوئی طالب علم آجاتا تھا تو اُسکے بشرے سے اور اُسکی وضع و انداز سے مترشح ہو جاتا تھا کہ یہ طالب علم ہے اور یہ

علم دین کی تحصیل میں مشغول ہے۔ افسوس ہے کہ اب یہ رنگ مفقود ہوتا جاتا ہے اور دنیا کا رنگ طبائع میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بے تکلفی اور سادگی رخصت ہوتی جاتی ہے بلکہ ہو گئی۔ بعض کی وضع و انداز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بابو ہیں۔ ترکی ٹوپی سر پر ہے۔ شیروانی پہنے ہوئے ہیں جیب میں گھڑی لگی ہوئی ہے۔ انکو دیکھ کر طالب علمی کا یقین تو کیا احتمال بھی نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کے رئیس ہیں۔ نہ چہرے پر تقوی کے انوار ہیں نہ آواز و لہجہ میں خشوع و خضوع کے آثار ہیں۔ اگر کسی سے بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کوئی وکیل بیرسٹر گواہ عدالت سے جرح کر رہا ہے۔ اگر عبارت تحریر کرینگے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعزیرات ہند کی دفعات لکھ رہے ہیں۔ کتاب میں جی نہیں لگاتے۔ اخباروں اور پرچوں میں بحیلہ خدمتِ دین مضامین لکھتے ہیں۔ مطالعہ و تکرار سبق سے نفور ہیں اور مناظرہ اور تقریر کے برجستہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان میں بعض لوگ اسکی تاویل کرتے ہیں کہ ضرورتِ زمانہ ان امور پر مجبور کرتی ہے کہ تحریر و تقریر ایسی ہو کہ پسندیدۂ ابنائے زماں ہو تاکہ ان کو تبلیغ کر سکیں۔ میں اسکا مخالف نہیں ہوں واقعی اسکی تحصیل ضروری ہے لیکن اسکے اندر جو مفسدہ خفیہ ہے اسکی اطلاع بھی ضروری ہے وہ یہ کہ تجربہ کی رو سے ایسی تقریر و تحریر حب جاہ پیدا کرنے والی ہے اور خلوص کے رنگ کو ملیا میٹ کرنے والی ہے اور قلوب میں ترقی مذموم کا

مضمون جما دینے والی ہے اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طالب علمی اخلاص اور سادگی قلب سے جدا ہو کر صرف عبارت آرائی اور دعوئی ہی دعوے رہ جاتے ہیں۔ اسلئے میرے نزدیک عام طلبہ کو عموماً ایسی تقریر و تحریر اور نئی روشنی والوں کے ساتھ افادہ کی غرض سے یا استفادہ کی نیت سے ملنے سے قطعاً روکا جائے اور تبلیغ احکام اور مخالفین کے مضامین کو رد کرنے کے لئے منتہی طلبہ کی ایک جماعت کو منتخب کیا جاوے اور اول انکو حضرات اہل اللہ کی خدمات میں بھیجا جائے کہ چند روز وہاں رہ کر اپنے اخلاق کی درستی کریں اور خلوص کا کچھ حصہ حاصل کریں۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ صوفی بنیں یا ذکر کی ضربیں لگائیں مقصود یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اخلاص کا کچھ حصہ ضرور انکو ملے گا۔ اور پہلے زمانے میں اسکی ضرورت نہ تھی اسلیے کہ مخلصین کی کثرت تھی اور یہ نیا رنگ طبائع میں نہ تھا لیکن اب ضرورت شدید ہے۔ جب وہ ایک کافی مدت میں انکی خدمت سے مستفید ہو جائیں اسوقت انکو منصب مناظرہ تحریری یا تقریری پر مقرر فرما دیں۔ اس کے بعد خواہ انکی تحریر و تقریر کسی طرز کی ہو مضر نہ ہو گی۔ اور عام طلبہ کو ایسی تقریرات و تحریرات سے قطعاً روکیں۔ جو لوگ ایسی تقریر و تحریر کے عادی ہو رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس تقریر و تحریر کا خاک اثر نہیں صرف ایک تحریک اور

برائی اُس کاتب و مقرر کی. اس سے بعض بے وقوفوں کے نزدیک ہو جاتی ہے. باقی جو غایت ہے یعنی اصلاح وہ ہرگز اس سے نہیں ہوتی فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وّ آلہ وصحبہ اجمعین۔ تمت بالخیر

۱۴ جمادی الثانی ۱۳۳۲ سنہ ہجری

رحمۃ المتعلمین

فی زمانہ طلباء، مدرسین، کاتبین اور عامہ مومنین کی اسلامی تربیت اور اصلاح کے لئے یہ رسالہ مؤلفہ مولانا عبد الرحمن صاحب خلیفہ خاص حضرت حکیم الامۃ رحمہ نہایت ہی اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ ہر طبقہ کے لئے نہایت ہی ضروری اور مفید ہے۔ حقوق العلم اور نافع الطلباء کی طرح خود بھی اس کا مطالعہ کیجئے۔ اپنے بچوں، شاگردوں اور احباب کو بھی سنائیے۔ قیمت ... ۲/۰۰

صحیح رہنمائی

۔۔۔ربہ شاہد ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے بیشمار ملفوظات، مواعظ
۔۔۔یف کے ذریعے عوام اور نو تعلیم یافتہ بلکہ علماء وصوفیاء کو رسمی تصوف، گمراہ کن
۔۔۔ نیچریت سے نکال کر صحیح عقائد، عبادات، شرعی معاملات اور اسلامی
۔۔۔ت و سیاست کی طرف رہنمائی کی۔
۔۔۔ری غفلت نے آج کل اس بددینی اور لادینی کے تریاق ذخیرہ کے اکثر
۔۔۔ہ کو ایسا کمیاب بلکہ نایاب کر دیا کہ موجودہ مسموم فضا سے متاثر نئی امت اس
۔۔۔ائی سے ناآشنا اور محروم ہے۔
۔۔۔ چونکہ ان کی یکلخت اشاعت کے لئے لاکھوں روپیہ بھی کم تھا۔ لہٰذا اپنی اور
۔۔۔ کی سہولت کے لئے ادارہ نے دو تین ماہ کے فاصلہ پر $\frac{20\times30}{16}$ سائز کے تقریباً ۲۵۰
۔۔۔ات کی قسطوار اشاعت شروع کر دی ہے مارچ ۱۹۶۶ء تک نمبرہ قسطیں شائع
۔۔۔ں ہر قسط کی قیمت ۲/۵۰ اور مستقل ممبری میں نام لکھانیوالوں کیلئے مع محصول ۲/۱۰ ہے
۔۔۔یل پر خط لکھ کر آج ہی پروگرام منگا لیجئے اور ممبری میں نام لکھا لیجئے۔

۔۔۔ناظم: مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر